ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابو الاعلیٰ مودودی

دار الاسلام جمال پور، پٹھانکوٹ

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

قیمت سالانہ [illegible]

تفہیمات

بعض معرکۃ الآرا مسائلِ اسلامی کی تشریح و توضیح

یہ کتاب مؤلف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اسلام کے ان مہمات مسائل کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جن کے متعلق آج کل عموماً لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں ۔ مثلاً توحید، ہدایت و ضلالت، عبادت، جہاد، آزادی، رواداری قومیت اسلامی، عقیدۂ توحید کے ساتھ ایمان بالرسالت کا ضروری ہونا، رسول کی صحیح حیثیت، رسالت محمدی کا ثبوت عقلی، شریعت اسلامی میں حدیث کی اہمیت قرآن اور حدیث کا باہمی تعلق، منکرین حدیث کے شبہات کا ازالہ وغیرہ۔

حصہ دوم زیر طبع ہے اور وہ بھی ایسے ہی اہم مسائل پر مشتمل ہے۔

قیمت مجلد ۳ روپے علاوہ محصولڈاک

تنقیحات

تنقیحات } یہ مولف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جنمیں اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر تنقیدی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے بحث کی گئی ہے۔ مسلمانوں کی زندگی پر جن جن پہلوؤں سے مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی تعلیم نے اثر ڈالا ہے۔ قریب قریب اِن سب پر ان مضامین میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور اِن اُلجھنوں کو صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو مغرب سے مرعوب اور اسلام سے ناواقف ہونے کی بدولت عموماً مسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہوگئی ہیں۔

ضخامت ۴۰۰ صفحات۔ قیمت غیر مجلد -/-/۲ علاوہ محصولڈاک

فہرست مضامین

رمضان و شوال ۱۳۶۲ھ ستمبر ۔ اکتوبر ۱۹۴۳ء جلد ۲۳، عدد ۳، ۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

جن لوگوں نے قرآن اور حدیث کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہیں کہ اسلام کی نگاہ میں اصل اہمیت فرد کی ہے نہ کہ جماعت یا اجتماعی نظام کی۔ ہر ہر فرد انسانی کو اللہ تعالیٰ نے شخصیت عطا کی ہے، خودی کا احساس دیا ہے، انفرادی خصوصیات بخشی ہیں، دیکھنے کے لئے آنکھیں دی ہیں۔ سننے کیلیے کان دیے ہیں، سوچنے، سمجھنے اور رائے قائم کرنے کے لیے دل دیا ہے، خواہش، تمیز، ارادے اور فیصلے کی قوتیں دی ہیں، اور اپنی ملکیت میں سے بہت سی چیزیں امانۃً اس کے سپرد کرکے ان پر تصرف کے اختیارات اسے عطا کئے ہیں۔ اس بنا پر ایک ایک انسان منفرداً اللہ کا خلیفہ ہے اور خلیفہ ہونے کی حیثیت سے ذمہ دار اور جواب دہ ہے یہی بات ہے جسے قرآن بار بار دہراتا ہے۔ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ - كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ - لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ - لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ - لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ۔ یہ سب اسی حقیقت کے اعلانات ہیں۔ اور اسی کو اس مشہور حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے کہ الا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ۔ پھر اسی بات کو قرآن آخرت کے ذکر میں بکثرت بیان کرتا ہے کہ اللہ کی عدالت میں ایک ایک انسان انفرادی حیثیت سے اپنا حساب دیگا اور جو کچھ برائی یا بھلائی اس نے دنیا کی زندگی میں کمائی تھی اس کا نتیجہ دیکھے گا۔ یعنی جس طرح شخصیت انفرادی ہے اور ذمہ داری انفرادی ہے اسی طرح نتیجہ وانجام بھی آخرکار انفرادی ہی ہے۔ اور اس نتیجہ وانجام کے خوب یا زشت ہونے اور خوبی وزشتی کے مختلف مدارج میں سے کسی درجہ پر پہنچنے کا تمام تر انحصار اس پر ہے کہ اس نے دنیا کی زندگی میں کس قسم کی شخصیت اپنے اندر پرورش کی، کن صفات کا اکتساب کیا، کس طرح ان قوتوں سے

کام لیا جو اللہ نے اسے دی تھیں، کس طرح اُس امانت میں اپنے اختیارات استعمال کیے جو اللہ نے اسے سونپی تھی، اور اپنی تکمیل کے لیئے اُن ذرائع سے کہاں تک فائدہ اٹھایا جو اسے حاصل تھے۔

پس یہ حقیقت ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے فرد کی شخصیت کا ارتقاء اور اسکی ذات کی تکمیل بجائے خود مطلوب ہے۔ دین کا مخاطب فرد ہے، خدا کی عبدیت اور اطاعت کی طرف فرد کو دعوت دی گئی ہے، حقوق اور فرائض فرد پر عاید کیے گئے ہیں، امر و نہی کے احکام فرد کو دیے گئے ہیں، طاعت پر جزا کی امید فرد کو دلائی گئی ہے اور عصیان پر سزا کی دھمکی بھی فرد ہی کو دی گئی ہے۔ اس نظام فکر و عمل میں فرد ہی وہ اصل اکائی ہے جس کو ابتداء میں عامل کی حیثیت سے اور انتہا میں نتیجۂ عمل پانے والے کی حیثیت سے بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اسی کی عقل اور جذبات سے یہ اپیل کرتا ہے، اسی کو اپنی ہدایت و رہنمائی کا مخاطب بناتا ہے، اسی کی فلاح کا طالب ہے اور اسی کو خسران سے بچانا چاہتا ہے۔ اگر فرد اپنی جگہ ناقص رہ جائے اور اپنی شخصیت کو پستی میں گرا دے تو آخری فیصلہ میں اُس جماعت اور اجتماعی نظام کی خوبی اس کے لیے کچھ بھی نافع نہیں ہو سکتی جس سے وہ دنیا میں تعلق رکھتا تھا، بلکہ اگر وہ کسی اچھی جماعت اور صالح اجتماعی نظام سے وابستہ تھا اور پھر اس نے اپنی تکمیل ذات اور ارتقاء شخصیت کے ان مواقع سے فائدہ نہ اٹھایا جو اسے حاصل تھے، تو یہ چیز اس کے خلاف ایک اور قوی دلیل بن جائیگی اور اسے اور زیادہ خسران میں مبتلا کریگی۔ بخلاف اس کے اگر وہ اپنی کوشش سے اس کمال کو پہنچ جائے جس کو وہ پہنچ سکتا تھا اور اپنی شخصیت کو اتنا بہتر نشو و نما دے جتنا وہ دے سکتا تھا، تو جماعت اور اجتماعی نظام کا فساد اس کی فلاح و نجات میں مانع نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ چیز اس کے حق میں ایک دلیل ہوگی کہ اس نے ناموافق حالات میں ترقی کے لیے اتنی کامیاب جد و جہد کی۔ یہی معنی ہیں اس آیت کے جو سورۂ مائدہ میں ارشاد ہوئی ہے کہ علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اھتدیتم۔ اور اس کے عکس کی صحت پر خود اسی آیت کا مضمون دلالت کرتا ہے۔ یعنی یہ کہ لا ینفعکم من اھتدیٰ اذا ضللتم۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ جماعت اور اجتماعی نظام کی صلاح اسلام کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

فی الواقع اس کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے مگر اس حیثیت سے نہیں کہ وہ بجائے خود مطلوب ہے بلکہ اس حیثیت سے کہ فرد کی شخصیت کا ارتقار اور اس کی ہر ذات کی تکمیل جماعت ہی کی اصلاح اور اجتماعی نظام ہی کی بہتری پر منحصر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدمیوں کو فرد فرد کی صورت میں پیدا تو ضرور کیا ہے مگر فرد فرد کی صورت میں رکھا نہیں ہے۔ ہر شخص اُس اجتماعی عمل کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے جو ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان واقع ہوا تھا۔ پیدا ہونے سے پہلے ہی اجتماعی زندگی کے بہت سے وہ ثمرات جو اس کی ماں اور اس کے باپ نے اپنے اندر جذب کیے تھے، موروثی صفات و خصائص کی صورت میں اس کے اندر پیوست ہو چکے ہوتے ہیں اور وہ اس کی شخصیت کے نشوونما پر اچھا خاصا اثر ڈالتے ہیں۔ ماں کے پیٹ سے باہر آتے ہی وہ ایک جماعت کے درمیان آنکھ کھولتا ہے اور اجتماعی زندگی اُس ساعت سے لیکر موت کی گھڑی تک پیہم اس پر اثر ڈالتی اور اس سے اثر قبول کرتی رہتی ہے۔ اگر اجتماعی ماحول کسی غلط نظام پر قائم ہو، اس کی آب و ہوا صلاح کے بجائے فساد کو پرورش کرنے والی ہو، اسکی زمین خیر کے بجائے شر کیلیے سازگار ہو تو ان حالات میں اکثر و بیشتر افراد کی تکمیلِ ذات دشوار بلکہ محال ہے، یہاں تک کہ بسا اوقات اس ماحول میں وہ حالت پیدا ہو جاتی ہے جسے دیکھ کر ایک جلیل القدر پیغمبر پکار اٹھتا ہے کہ رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا۔ إِنَّكَ إِن تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا۔ اس لیے یہ ناگزیر ہے کہ جماعت کو درست اور اجتماعی نظام کو پاک کیا جائے تاکہ بیشتر انسانی افراد کے لیے ایسا سازگار ماحول پیدا ہو جس میں ان کی شخصیتیں صحیح نشوونما پا سکیں۔ حرام کی روٹی، جس سے پرورش پائے ہوئے گوشت پوست کیلئے جنت حرام ہے اور جس کے حق میں نبی صادق و مصدوق نے خبر دی ہے کہ آتش دوزخ ہی اس کے لیے اولیٰ ہے۔ آخر کوئی فرد اس سے کیونکر بچے اور رزق حلال کہاں پائے جب کہ ایک غلط نظامِ معیشت نے رزق کے سارے چشموں کو گندہ کر دیا ہو؟ جاہلیت کے اخلاق، افکار اور اعمال جو انسان کے لیے ابدی خسران کے موجب ہیں۔ آخر کوئی شخص ان سے کس طرح محفوظ رہے جب کہ تمدن، معاشرت، تعلیم، سب پر جاہلیت پورے زور کے ساتھ چھائی ہوئی ہو اور اس کا زہر وبائی سمیت کی طرح سارے اجتماعی ماحول میں سرایت کر گیا ہو؟ معصیتِ خدا و رسول جس

کے ساتھ کسی کمال کے حصول اور کسی شخصیت کے ارتقاء کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ آخر کوئی شخص اس سے کہاں تک پرہیز کرسکتا ہے جب کہ ایک کافرانہ نظام سیاست نے کامل تسلط حاصل کر کے پوری پوری قوموں کو کفر اور ظلم اور فساد کی خدمت پر مجبور کردیا ہو؟ پس فرد کی نجات و فلاح بہت مشکل بلکہ محال ہے اگر اس کی ترقی اور تکمیل کے راستے سے ان موانع کو دور نہ کیا جائے جو ایک بگڑی ہوئی جماعت اور ایک فاسد نظام اجتماعی کی بدولت پیدا ہوتے ہیں، اور ایک ایسا صالح اجتماعی نظام نہ قائم کردیا جائے جو اس تکمیل اور ترقی میں مددگار ہو۔

یہ اس معاملہ کا ایک پہلو ہے۔ اور اسی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ترقی اور تکمیل کا راستہ ہی اجتماعی زندگی کے اندر رکھا ہے نہ کہ اس کے باہر۔ فرد کی وہ امتحان گاہ جس میں اسے اپنی لیاقت یا نالائقی ثابت کرنی ہے، اور جس میں کامیابی یا ناکامی ہی پر آخرت میں اس کی فلاح یا خسران کا مدار ہے، کسی خلوت کدے یا کسی سنسان جنگل میں واقع نہیں ہے بلکہ حیات اجتماعی کے عین منجدھار میں واقع ہے۔ اس کو اکیلا نہیں رکھا گیا ہے بلکہ دوسرے انسانوں کے ساتھ بے شمار تعلقات کے رشتوں میں باندھ دیا گیا ہے۔ وہ کسی کا بیٹا، کسی کا بھائی، کسی کا شوہر، کسی کا باپ، کسی کا دوست، کسی کا دشمن، کسی کا ہمسایہ، کسی کا اجیر، کسی کا مستاجر، کسی کا حاکم، کسی کا محکوم، کسی کا بائع، کسی کا مشتری، کسی کا امین، کسی کا موتمن بنایا گیا ہے اور اس کا امتحان ہی اس امر میں ہے کہ ان تعلقات میں بندھ کر، ذمہ داریوں اور امانتوں کے بوجھ سے لد کر، خوف اور لالچ، محبت اور غضب، امید وں اور مایوسیوں کے ماحول میں رہ کر وہ کس طرح اللہ کے عائد کردہ حقوق اور فرائض ادا کرتا ہے، کس طرح اس کے مقرر کردہ حدود پر قائم رہتا ہے، کس طرح خلافت کے اس منصب سے عہدہ برا ہوتا ہے جو اس کے سپرد کیا گیا ہے، کن صفات کا اکتساب کرتا ہے، کن خصوصیات کو اپنے اندر نشو ونما دیتا ہے اور اپنی سیرت و کردار کے کیسے نقوش دنیا میں چھوڑ کر جاتا ہے۔ نیکی کا جو تصور اسلام پیش کرتا ہے وہ ہر معنی سے خالی ہو جاتا ہے اگر فرد کو اجتماعی زندگی سے الگ کرلیا جائے۔ جس شخص نے تمدنی تعلقات کے جتنے کم شعبوں میں قدم رکھا ہے اور جتنی کم ذمہ داریاں لی ہیں، اس نے گویا اسی قدر کم پرچوں میں امتحان دیا ہے اور اس لحاظ

سے اپنی شخصیت کو اتنے ہی پہلوؤں میں تکمیل کے مواقع سے محروم کر لیا ہے۔ حتیٰ کہ جس نے خلوت میں رہبانیت کی زندگی گزاری اس نے اپنے امتحان کے اکثر و بیشتر پرچے سادہ اوراق کی صورت میں بھیج دیے جن پر وہ سرے سے کوئی نمبر پانے کا مستحق ہی نہیں ہے۔

اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ فرد کی تکمیل ذات اجتماعی زندگی کے اندر ہی ہو سکتی ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بیش تر اور بزرگ تر احکام سرے سے تشنۂ تعمیل رہ جاتے ہیں اگر انسانی اجتماع کی زمام کار اہل خیر کے ہاتھ میں نہ ہو۔ تمدن اور سیاست اور معیشت کی عنان اقتدار پر باغیوں کا قبضہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی شریعت معطل رہے، اس کی زمین میں صلاح کے بجائے فساد پھیلے، اس کی خلق میں امر بالمعروف کی جگہ امر بالمنکر ہو اور نہی عن المنکر کے بجائے نہی عن المعروف ہونے لگے۔ یہ وہ حالت ہے جس سے بڑھ کر اللہ کو مبغوض کوئی چیز نہیں، اور کسی شخص کا اس حالت میں رہتے ہوئے یہ توقع رکھنا کہ وہ خلوت کے مراقبوں اور ریاضتوں سے، یا نیکی اور تقوےٰ کے چند مظاہر سے، یا ان احکام کی تبلیغ سے جو کفار کے لیے نامرغوب نہ ہوں، اپنی ذات کی تکمیل کر سکے گا محض ایک خام خیالی ہے ان حالات میں تکمیل ذات اور ارتقاء شخصیت کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ فرمانروائی کے مقام سے خدا کے باغیوں کو ہٹانے کی کوشش کی جائے اور سعی وجہد کی ساری قوتیں اس مقصد میں صرف کر دی جائیں کہ خدا کے ملک میں اس کی شریعت جاری ہو، اس کی زمین فساد سے پاک ہو کر خیر وصلاح سے بھر جائے، اور اس کی خلق میں حکم معروف کا چلے اور منکر ضابطۂ تعزیرات میں جگہ پائے۔

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جماعت اور اجتماعی زندگی کی اسلام میں کتنی بڑی اہمیت ہے، لیکن اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اصل اہمیت فرد ہی کو حاصل ہے، کیونکہ اجتماعی صلاح کا قیام اور اجتماعی فساد کی بیخ کنی افراد ہی کی فلاح وترقی کے لیے مطلوب ہے۔

اس کے بعد یہ کہنے کی کوئی حاجت باقی نہیں رہتی کہ تمام نظامات فکر وعمل سے بڑھ کر اسلام انفرادی اصلاح

وتزکیہ کو اہمیت دیتا ہے۔ اس کا نقطۂ نظر اُن نظامات سے بھی مختلف ہے جو جماعت سے قطع نظر کر کے فرد کو مجرد فرد ہونے کی حیثیت سے لیتے ہیں اور اجتماعی زندگی سے الگ تھلگ رکھ کر اس کو روحانی ارتقاء کے مدارج طے کرانا چاہتے ہیں۔ اور اُن نظامات سے بھی جو فرد کی انفرادی حیثیت کو نظر انداز کر کے اس کی ذات کو محض جماعت کی خاطر اہمیت دیتے ہیں اور افراد کو صرف اس لئے تیار کرنا چاہتے ہیں کہ کسی اجتماعی نصب العین کے حصول میں ان کی تربیت یافتہ قوتوں کو استعمال کیا جائے۔ ان دونوں نقطہائے نظر سے الگ اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ نوع انسانی کا ایک ایک فرد اپنی انفرادی حیثیت میں خدا کے سامنے جواب دہ ہے اسلیے ہر ایک کو فرداً فرداً خدا کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے تیار ہونا چاہیے، مگر چونکہ خدا کے سامنے اس کی جواب دہی بہت بڑی حد تک اجتماعی حقوق، فرائض اور ذمہ داریوں ہی سے متعلق ہے، اور آخری امتحان کی کامیابی کے لیے اس کا تیار ہونا بجائے خود بھی اجتماعی صلاح و فلاح پر منحصر ہے، اور خدا کی رضا حاصل کرنے میں وہ کامیاب نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنی حد استطاعت میں فساد کو مٹانے اور خدا کے احکام اس کی زمین اور اس کی خلق پر جاری کرنے کا وہ فرض انجام نہ دے جو خلیفہ ہونے کی حیثیت سے اس پر عائد کیا گیا ہے، لہٰذا فرد کی تیاری محض اپنی ذاتی اصلاح ہی کی حد تک نہ ہونی چاہیئے بلکہ اس درجہ کی ہونی چاہیے کہ وہ غیر صالح اجتماعی نظاموں سے لڑسکے اور ایک صالح اجتماعی نظام کو قائم کرنے اور قائم رکھنے کا بل بوتا اس میں پیدا ہوجائے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے افراد کے تزکیۂ نفس اور تعمیر سیرت کے لیے وہ نقشہ بنایا ہے جو تمام دوسرے نقشوں سے اپنے مقصد میں بلند تر، اپنے نقطۂ نظر میں وسیع تر اور اپنی جزرسی میں باریک تر ہے۔ اگر مختصر اور جامع الفاظ میں کوئی اس نقشے کی تعریف کرنا چاہے، تو غالباً سب سے زیادہ موزوں تعریف یہ ہوگی کہ اسلام کے پیش نظر ایسے انسان تیار کرنا ہے جو متخلق باخلاق اللہ ہوں، صحیح معنوں میں خلیفۃ اللہ بن کر زمین میں کام کریں، اور اس کام کے صلہ میں اللہ کے تقرب سے سرفراز ہوں۔

مگر صدیوں کے انحطاط سے مسلمانوں کے اندر جہاں اور بہت سے تغیرات ہوئے ہیں، تزکیۂ نفس کے باب میں بھی ان کا تصور اصل اسلامی تصور سے بہت کچھ مختلف ہوگیا ہے۔ ان کے مقصد میں بھی تغیر آگیا ہے، نقطۂ نظر بھی

محدود ہوگیا ہے، اور تزکیۂ نفس کے طریقے بھی اُن طریقوں سے مختلف ہوگئے ہیں جو عہد نبوت میں اختیار کیے گئے تھے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ تزکیۂ نفس کے بڑے بڑے ادارے اور سلسلے مدتوں سے قائم ہیں اور انکی برکت سے بڑی بڑی پاکیزہ شخصیتوں کے انسان بھی پیدا ہوتے رہے ہیں، لیکن اُس پیمانے کے انسان ابھی تک تیار نہ ہوسکے جو جاہلیت کی راہوں پر دنیا کو چلانے والی زبردست قوتوں کے مقابلہ میں اٹھیں اور ان سے زور آزمائی کرکے اسلام کو دنیا کا رہنما وکارفرما دین بنانے کی کوشش کریں۔ اور یہ تو خیر بہت بڑا کام ہے، یہاں تو ایسے انسان بھی فراہم نہ ہوسکے جو کم ازکم اتنا ہی کرسکتے کہ اسلام کے دائرۂ نفوذ و اثر میں جاہلیت کی قاہرانہ پیش قدمی کو روک دیتے۔ بڑے بڑے نفوس زکیہ موجود تھے اور موجود ہیں جو اپنے علم، اپنی دیانت، اپنی پرہیزگاری اور اپنی پاکیزہ زندگی کے لیے یقیناً خراج تحسین کے مستحق ہیں، لیکن ان نفوس کی موجودگی ہی میں جاہلیت اپنی تلوار سے، اپنے قلم سے، اپنے علوم وفنون سے، اپنی تہذیب اور اپنے تمدن سے نہ صرف دنیا کو بلکہ خود مسلمان ملکوں اور قوموں کو بھی فتح کرتی چلی گئی ہے اور چلی جارہی ہے۔ آخر اس کمزوری کا کوئی سبب تو ضرور ہے، اور جو سبب بھی ہے اس کی تحقیق میں بیجا عقیدت مانع نہ ہونی چاہیے۔

ہمارے ہاں ایک بڑے گروہ کے نزدیک تزکیۂ نفس کا مقصد یہ رہا ہے کہ اسی زندگی میں مشاہدۂ حق نصیب ہو جائے اور ایمان بالغیب کے مقام سے ترقی کرکے ایمان بالشہادت کی دولت حاصل ہو۔ ظاہر نظر میں یہ ایک بلند ترین اور پاکیزہ ترین مقصد ہے، لیکن قرآن نے کہیں ہم کو یہ تعلیم نہیں دی کہ ہم اسے مقصود قرار دے کر اپنی کوشش اس راہ میں صرف کریں۔ بلکہ اس کے برعکس اگر ہم بطور خود اسے مقصود قرار دے بھی لیں تو قرآن ہمیں یقین دلاتا ہے کہ یہ گوہر مقصود اس زندگی میں نبی کے سوا کسی کے ہاتھ نہیں آسکتا۔ عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ (یعنی حقائق غیب کا جاننے والا اللہ ہے اور وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا بجز اُس رسول کے جس کو اس نے خود منتخب کیا ہو، پھر وہ اس کے آگے اور پیچھے نگرانی کرنے والے فرشتے لگا دیتا ہے یہ معلوم کرنے

کے لیے کہ ان رسولوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیے، اس سے معلوم ہوا کہ پردۂ غیب میں چھپی ہوئی حقیقتوں، یا بالفاظ دیگر مابعد الطبیعی حقیقتوں کے مشاہدے کی کوشش فضول بھی ہے، غلط بھی اور اس کے کامیاب ہونے کا بھی امکان نہیں ہے۔ انسان کو ان حقائق کے جتنے اور جس قدر علم کی ضرورت تھی اللہ نے وہ علم اپنے رسولوں کے ذریعہ سے دے دیا ہے اور یہ اللہ کا بڑا احسان ہے کہ اس طرح اس نے انسان کو ان چیزوں کی تلاش و جستجو کی زحمت سے بچا دیا۔ اب انسان کا کام صرف یہ ہے کہ وہ رسولوں کے دیے ہوئے علم پر ایمان بالغیب لائے اور جو خدمات اس کے سپرد کی گئی ہیں انہیں اطمینان کے ساتھ انجام دینے میں لگا رہے۔ لیکن اگر اس پر بھی کوئی شخص خواہ مخواہ یہ زحمت اٹھانا ہی چاہے تو اس کی حیثیت خدا کے بلائے ہوئے مہمان کی نہ ہوگی کہ اس کے لیے دروازے کھولے جائیں اور پردے اٹھائے جائیں، بلکہ اس کی حیثیت ایک نقب زن کی سی ہوگی جو خود روزن بنا کر اندر جھانکنا چاہتا ہو۔ سو اللہ کے حرم میں اس نقب زنی کی کوشش ظاہر ہے کہ کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اگر بالفرض کوئی اس حرم کی سرحد کے قریب پہنچ بھی گیا تو رسولوں کیلیے حفاظت و نگہبانی کا جو غیر معمولی انتظام کیا جاتا ہے اس سے تو وہ بہرحال محروم ہی ہوگا، اسلیے اگر بدقسمتی سے حقیقت کی جھلک وہ دیکھیگا اس میں نفس کی غلط فہمیوں، نظر کے دھوکوں اور شیاطین کی دراندازیوں کے بیشمار خطرات ہونگے جن کی بدولت عجب نہیں کہ ایمان بالشہادت کی نعمت پانے کے بجائے ایمان بالغیب کی دولت سے بھی ہاتھ دھونا پڑ جائے۔

اس سے فروتر تزکیۂ نفس کا جو مقصد بتایا جاتا ہے وہ روحانی ترقی ہے۔ مگر یہ روحانی ترقی کچھ ایسی مبہم اور پر اسرار چیز ہے کہ تمام عمر اس بھول بھلیاں میں گشت لگانے کے بعد بھی آدمی کو کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کس مقام پر پہنچا۔ اس کی سطحیں، اس کی منزلیں، اس کے ثمرات و نتائج، سب مرموز ہیں جن کو ہم جیسے عامی کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ ہمیں اگر کچھ نظر آتا ہے تو وہ صرف یہ کہ اس راہ میں جو منزلیں طے کی جاتی ہیں ان میں وہ منزل کبھی نہیں آتی جسے بلال اور عمار او صہیب نے طے کیا تھا اور نہ وہی منزل کبھی آنے کی توقع کی جا سکتی ہے جس کو ابوبکر و عمر نے طے کیا۔

اسلام کے مقصد سے قریب ترین مقصد اُن لوگوں کا ہے جو تزکیۂ نفس سے تقویٰ کا حصول چاہتے ہیں لیکن یہاں ایک دوسری مصیبت پیش آ جاتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ تقویٰ کے متعلق بالعموم لوگوں کا نقطۂ نظر بہت محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ بیشتر اصحاب کے نزدیک تو تقویٰ سے مراد محض لباس، وضع و قطع، نشست و برخاست، اکل و شرب وغیرہ امور کے متعلق

اس ظاہری نقشہ پر اپنی زندگی کو ڈھال لینا ہے جس کے جزئیات احادیث میں بیان ہوئے ہیں۔ نیز چند مذہبی اعمال کی پابندی کرنے اور معمول سے کچھ زیادہ عبادات کر لینے سے تقویٰ کی تکمیل ہو جاتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جن لوگوں نے تقوے کی اس ظاہری شکل کو اختیار کر لیا ہے انہیں متقی کہا اور سمجھا جاتا ہے اور وہ خود بھی مطمئن ہو جاتے ہیں کہ انہوں نے اپنے اندر تقویٰ پیدا کر لیا ہے، حالانکہ فی الحقیقت روح تقویٰ کی ان میں بہت کمی ہوتی ہے اور بسا اوقات عملی زندگی کی آزمائشوں میں ایسی ایسی غیر متقیانہ حرکات ان سے سرزد ہو جاتی ہیں جن کی بدولت تقویٰ کی اس ظاہری شکل کا بھرم بھی جاتا رہتا ہے۔ اس عام تصور سے بلند تر اور وسیع تر تصورِ تقویٰ جو خواص میں پایا جاتا ہے وہ بھی اس سے زیادہ نہیں ہے کہ انفرادی زندگی میں آدمی خدا ترس، عبادت گزار اور ذاکر و شاکر رہے، معاملات میں دیانت، امانت، راستبازی، اور حدود اللہ کا پابند ہو، اور دوسرے افراد کے ساتھ معاشرت میں خوش اخلاقی، ہمدردی، مواساۃ، انصاف اور حق رسانی کے طریقہ پر عامل رہے۔ اس محدود تصور میں وسیع تر اجتماعی مسائل کے فہم و ادراک کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ اسلیے ہمارے بہترین صلحاء کے ہاں بھی جو تزکیۂ نفس کیا جاتا ہے اس کا فائدہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ خدا کی باغی حکومتوں کو پرہیزگار رعیت اور متدین ملازم بہم پہنچ جائیں۔ خود ان کی تعلیم و تربیت جیسی رعایا اور جیسے ملازم فراہم کرتی ہے ان میں اور تو سب قابلیتیں ہوتی ہیں، مگر ایمانداری اور راست بازی نہیں ہوتی اس لیے وہ اُن کا اچھا خاصا نقصان بھی کر دیتے ہیں۔ یہ کمی ہمارے تزکیۂ نفس کے اداروں سے پوری ہوتی ہے جو غلبۂ کفر کے لیے لڑنے اور نظام کفر کو چلانے کے لیے راستباز آدمی تیار کرتے ہیں اور کفر کی حکمرانی کے لیے وہ رعیت پیدا کرتے ہیں جو اس کے لیے کم سے کم موجب پریشانی ہوتی ہے۔ حد یہ ہے کہ ہمارے ہاں اگر کوئی شخص کھلم کھلا کسی غیر الٰہی نظام کے قیام میں جان لڑاتا ہو تب بھی وہ جوں کا توں متقی رہتا ہے بشرطیکہ اس کی زندگی میں تقویٰ کے وہ جزئیات پائے جاتے ہوں جن کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ یہ سب لازمی نتائج ہیں اس محدود تصور کے جو ہمارے مذہبی طبقوں میں تقویٰ اور تزکیۂ نفس کے متعلق خواص سے لیکر عوام تک پھیلا ہوا ہے۔

تفہیم القرآن

(۱۳)

المائدہ

(از نصف رکوع ۱۳ - تا ختم سورہ)

تمہارے لیے سمندر کا شکار اور اس کا کھانا حلال کر دیا گیا[۱]، جہاں تم ٹھیرو وہاں بھی اُسے کھا سکتے ہو اور قافلے کے لیے زادِ راہ بھی بنا سکتے ہو، البتہ خشکی کا شکار جب تک تم احرام کی حالت میں ہو تم پر حرام کر دیا گیا ہے، پس بچو اس خدا کی نافرمانی سے جس کی پیشی میں تم سب کو گھیر کر حاضر کیا جائے گا۔

اللہ نے مکانِ محترم، کعبہ کو لوگوں کے لیے (اجتماعی زندگی کے) قیام کا ذریعہ بنایا اور ماہ حرام اور قربانی کے جانوروں اور قلادوں کو بھی (اس کام میں معاون بنایا)[۲] تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ آسمانوں

---

[۱] چونکہ سمندر کے سفر میں بسا اوقات زادِ راہ ختم ہو جاتا ہے اور غذا کی فراہمی کے لیے بجز اس کے کہ آبی جانوروں کا شکار کیا جائے اور کوئی تدبیر ممکن نہیں ہوتی اس لیے بحری شکار حلال کر دیا گیا۔

[۲] عرب میں کعبہ کی حیثیت محض ایک مقدس عبادت گاہ ہی کی نہ تھی بلکہ اپنی مرکزیت اور اپنے تقدس کی وجہ سے وہی پورے ملک کی معاشی و تمدنی زندگی کا سہارا بنا ہوا تھا۔ حج اور عمرے کے لیے سارا ملک اس کی طرف کھنچ کر آتا تھا اور اس اجتماع کی بدولت انتشار کے مارے ہوئے عربوں میں وحدت کا ایک رشتہ پیدا ہوتا، مختلف قبیلوں کے لوگ باہم تمدنی روابط قائم کرتے، شاعری کے مقابلوں سے ان کی زبان اور ادب کو ترقی نصیب ہوتی، اور تجارتی لین دین سے سارے ملک کی معاشی ضروریات پوری ہوتیں۔ حرام مہینوں کی بدولت عربوں کو سال کا پورا ایک تہائی زمانہ امن کا نصیب ہو جاتا جس میں بسہولت ان کے قافلے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک آتے جاتے تھے، اور قربانی کے جانوروں اور قلادوں کی برکت سے قافلے بحفاظت سفر کرتے تھے،

(باقی اگلے صفحہ پر)

اور زمین کے سب حالات سے باخبر ہے اور اسے ہر چیز کا علم ہے۔[۱۱۵] خبردار ہو جاؤ! اللہ سزا دینے میں بھی سخت ہے، اور اس کے ساتھ بہت درگذر اور رحم بھی کرنے والا ہے۔ رسول پر تو صرف پیغام پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے، آگے تمہارے کھلے اور چھپے سب حالات کا جاننے والا اللہ ہے۔ اے پیغمبر! ان سے کہدو کہ پاک اور ناپاک بہر حال یکساں نہیں ہیں خواہ ناپاک کی بہتات تمہیں کتنا ہی فریفتہ کرنے والی ہو۔[۱۱۶] پس اے لوگو جو عقل رکھتے ہو!
اللہ کی نافرمانی سے بچتے رہو، امید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہوگی۔ ع ۱۳

اے ایمان لانے والو! ایسی باتیں نہ پوچھا کرو جو تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں ناگوار ہوں[۱۱۷] لیکن

(بقیہ سابق) کیونکہ نذر کی علامت کے طور پر جن جانوروں کی گردن میں پٹے پڑے ہوتے انھیں دیکھ کر عربوں کی گردنیں احترام سے جھک جاتیں اور کسی غارتگر قبیلے کو ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ ہوتی۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱۱۵] یعنی اس انتظام پر غور کرو تو تمہیں خود اپنے ملک کی تمدنی و معاشی زندگی ہی میں اس امر کی بین شہادت مل جائے گی کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے مصالح اور ان کی ضروریات کا کیسا مکمل اور گہرا علم رکھتا ہے اور اپنے ایک ایک حکم کے ذریعہ سے انسانی زندگی کے کتنے کتنے شعبوں کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ بدامنی کے یہ سینکڑوں برس جو محمد عربی کے ظہور سے پہلے گذرے ہیں، ان میں تم لوگ خود اپنے مفاد سے ناواقف تھے اور اپنے آپ کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے تھے، مگر اللہ تمہاری ضرورتوں کو جانتا تھا اور اس نے صرف ایک کعبہ کی مرکزیت قائم کر کے تمہارے لیے وہ انتظام کر دیا تھا جس کی بدولت تمہاری قومی زندگی برقرار رہ سکی۔ دوسری بے شمار باتوں کو چھوڑ کر اگر صرف اسی ایک بات پر دھیان کرو تو تمہیں یقین حاصل ہو جائے گا کہ اللہ نے جو احکام تمہیں دیے ہیں ان کی پابندی میں تمہاری اپنی بھلائی ہے اور ان میں تمہارے لیے وہ وہ مصلحتیں پوشیدہ ہیں جن کو نہ تم خود سمجھ سکتے ہو اور نہ اپنی تدبیروں سے پورا کر سکتے ہو۔

[۱۱۶] یہ آیت قدر و قیمت کا ایک دوسرا ہی معیار پیش کرتی ہے جو ظاہر بین انسان کے معیار سے بالکل مختلف ہے۔ ظاہر بین نظر میں سو روپے بمقابلہ پانچ روپے کے لازماً زیادہ قیمتی ہیں کیونکہ وہ سو ہیں اور یہ پانچ۔ لیکن یہ آیت کہتی ہے کہ سو روپے اگر خدا کی نافرمانی کر کے حاصل کیے گئے ہیں تو وہ ناپاک ہیں، اور پانچ روپے اگر خدا کی فرماں برداری کرتے ہوئے کمائے گئے ہیں تو وہ پاک ہیں، اور ناپاک خواہ مقدار میں کتنا ہی زیادہ ہو، بہرحال وہ پاک کے برابر کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ غلاظت کے ایک ڈھیر

(باقی اگلے صفحہ پر)

(بقیہ سابق) عطر کا ایک قطرہ زیادہ قدر رکھتا ہے اور پیشاب کی ایک بریز نالے کے مقابلہ میں پاک پانی کا ایک چلو زیادہ وزنی ہے۔ لہٰذا ایک سچے دانشمند انسان کو لازماً حلال ہی پر قناعت کرنی چاہیے خواہ وہ ظاہر میں کتنا ہی حقیر و ذلیل ہو اور حرام کی طرف کسی حال میں بھی ہاتھ نہ بڑھانا چاہیے خواہ وہ بظاہر کتنا ہی کثیر و شاندار ہو۔

۱۱۸ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض لوگ عجیب عجیب قسم کے فضول سوالات کیا کرتے تھے جن کی نہ دین کے کسی معاملہ میں ضرورت ہوتی تھی اور نہ دنیا ہی کے کسی معاملہ میں۔ مثلاً ایک موقع پر ایک شخص بھرے مجمع میں آپ سے پوچھ بیٹھا کہ "میرا اصلی باپ کون ہے؟"۔ اسی طرح بعض لوگ احکام شرع میں غیر ضروری پوچھ گچھ کیا کرتے تھے، اور خواہ مخواہ پوچھ پوچھ کر ایسی چیزوں کا تعین کرانا چاہتے تھے جنھیں شارع نے مصلحتاً غیر معین رکھا ہے۔ مثلاً قرآن میں مجملاً یہ حکم دیا گیا تھا کہ حج تم پر فرض کیا گیا ہے۔ ایک صاحب نے حکم سنتے ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا "کیا ہر سال فرض کیا گیا ہے؟" آپ نے کچھ جواب نہ دیا۔ انھوں نے پھر پوچھا۔ آپ پھر خاموش ہوگئے۔ تیسری مرتبہ پوچھنے پر آپ نے فرمایا "تم پر افسوس ہے۔ اگر میری زبان سے ہاں نکل جائے تو حج ہر سال فرض قرار پا جائے۔ پھر تم ہی لوگ اس کی پیروی نہ کر سکوگے اور نافرمانی کرنے لگوگے"۔ ایسے ہی لایعنی اور غیر ضروری سوالات سے اس آیت میں منع کیا گیا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی لوگوں کو کثرتِ سوال سے اور خواہ مخواہ ہر بات کی کھوج لگانے سے منع فرماتے رہتے تھے۔ چنانچہ حدیث میں ہے ان اعظم المسلمین فی المسلمین جرما من سال عن شیء لم یحرم علی الناس فحرم من اجل مسألتہ۔ "مسلمانوں کے حق میں سب سے بڑا مجرم وہ شخص ہے جس نے کسی ایسی چیز کے متعلق سوال چھیڑا جو لوگوں پر حرام نہ کی گئی تھی اور پھر محض اس کے سوال چھیڑنے کی بدولت وہ چیز حرام ٹھیرائی گئی"۔ ایک دوسری حدیث میں ہے ان اللہ فرض فرائض فلا تضیعوھا وحرم حرمات فلا تنتھکوھا وحد حدودا فلا تعتدوھا وسکت عن اشیاء من غیر نسیان فلا تبحثوا عنھا۔ "اللہ نے کچھ فرائض تم پر عائد کیے ہیں، انھیں ضائع نہ کرو۔ کچھ چیزوں کو حرام کیا ہے، ان کے پاس نہ پھٹکو۔ کچھ حدود مقرر کی ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور کچھ چیزوں کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے بغیر اس کے کہ اُسے بھول لاحق ہوئی ہو، لہٰذا ان کی کھوج نہ لگاؤ"۔ ان دونوں حدیثوں میں ایک اہم حقیقت پر تنبیہ کیا گیا ہے۔ جن امور کو شارع نے مجملاً بیان کیا ہے اور ان کی تفصیل نہیں بتائی، یا جو احکام بر سبیلِ اجمال دیے ہیں اور مقدار یا تعداد یا دوسرے تعینات کا ذکر نہیں کیا ہے، ان میں اجمال اور عدم تفصیل کی وجہ یہ نہیں ہے کہ شارع سے بھول ہوگئی، تفصیلات بتانی چاہیے تھیں مگر نہ بتائیں۔ بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ شارع ان امور کی تفصیلات کو محدود نہیں کرنا چاہتا اور ان احکام میں لوگوں کے لیے وسعت رکھنا چاہتا ہے۔ اب جو شخص خواہ مخواہ

(باقی اگلے صفحہ پر)

اگر تم انھیں ایسے وقت پوچھو گے جب کہ قرآن نازل ہو رہا ہو تو وہ تم پر کھول دی جائیں گی۔ اب تک جو کچھ تم نے کیا اسے اللہ نے معاف کر دیا کہ وہ درگذر کرنے والا اور بردبار ہے۔ تم سے پہلے ایک گروہ نے اسی قسم کے سوالات کیے تھے، پھر وہ انہی کی وجہ سے کفر میں مبتلا ہو گئے۔[سلہ]

اللہ نے نہ کوئی بحیرہ مقرر کیا ہے نہ سائبہ اور نہ وصیلہ اور نہ حام۔[سٹلہ] مگر یہ کافر اللہ پر جھوٹی تہمت لگاتے ہیں (کہ ان چیزوں کو اس کی مقرر کردہ ٹھیراتے ہیں) اور ان میں سے اکثر بے عقل ہیں (کہ ایسے وہمیات کو مان رہے ہیں)۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس قانون کی طرف جو اللہ نے نازل کیا ہے اور آؤ پیغمبر کی طرف تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہمارے لیے تو بس وہی طریقہ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا یہ باپ دادا ہی کی تقلید کیے چلے جائیں گے خواہ وہ کچھ نہ جانتے ہوں اور صحیح راستہ کی انھیں خبر ہی نہ ہو؟

(بقیہ سابق) سوال پر سوال نکال کر تفصیلات اور تعینات اور تقیدات بڑھانے کی کوشش کرتا ہے، اور اگر شارع کے کلام سے یہ چیزیں کسی طرح نہیں نکلتیں تو قیاس سے، استنباط سے کسی نہ کسی طرح مجمل کو مفصل، مطلق کو مقید، غیر معین کو معین بنا کر ہی چھوڑتا ہے، وہ درحقیقت مسلمانوں کو بڑے خطرے میں ڈالتا ہے۔ اس لیے کہ مابعد الطبیعی امور میں جتنی تفصیلات زیادہ ہوں گی، ایمان لانے والے کے لیے اتنے ہی زیادہ الجھن کے مواقع بڑھیں گے، اور احکام میں جتنی قیود زیادہ ہوں گی پیروی کرنے والے کے لیے خلاف ورزی حکم کے امکانات بھی اسی قدر زیادہ ہوں گے۔

(حواشی صفحہ ہذا) سلہ یعنی پہلے انھوں نے خود ہی عقائد اور احکام میں موشگافیاں کیں اور ایک ایک چیز کے متعلق سوال کر کے تفصیلات اور قیود کا ایک جال اپنے لیے تیار کرایا، پھر خود ہی اُس میں اُلجھ کر اعتقادی گمراہیوں اور عملی نافرمانیوں میں مبتلا ہو گئے ــــ اس گروہ سے مراد یہودی ہیں جن کے نقشِ قدم پر چلنے میں، قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تنبیہات کے باوجود، مسلمانوں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے۔

سٹلہ جس طرح ہندوستان میں گائے، بیل اور بکرے خدا کے نام پر یا کسی بُت یا قبر یا دیوتا یا پیر کے نام پر پُن کر کے چھوڑ دیے جاتے ہیں اور ان سے کوئی خدمت لینا یا انھیں ذبح کرنا یا کسی طور پر ان سے فائدہ اٹھانا حرام سمجھا جاتا ہے، اسی طرح

(باقی اگلے صفحہ پر)

اے ایمان لانے والو! اپنی فکر کرو، کسی دوسرے کی گمراہی سے تمہارا کچھ نہیں بگڑتا اگر تم خود راہ راست پر ہو۔[1] اللہ کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے، پھر وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔

اے ایمان لانے والو! جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجائے اور وہ وصیت کر رہا ہو تو اس کے لیے شہادت کا نصاب یہ ہے کہ تمہاری جماعت میں سے دو صاحب عدل[2] آدمی گواہ بنائے جائیں، یا اگر تم سفر کی حالت میں ہو اور وہاں موت کی مصیبت پیش آجائے تو غیر مسلموں ہی میں سے دو گواہ لے لیے جائیں۔[3] پھر اگر کوئی شک پڑ جائے تو نماز کے بعد دونوں گواہوں کو (مسجد میں) روک لیا جائے اور

(بقیہ سابق) زمانہ جاہلیت میں اہل عرب بھی مختلف طریقوں سے جانوروں کو پُن کر کے چھوڑ دیا کرتے تھے اور ان طریقوں سے چھوڑے ہوئے جانوروں کے الگ الگ نام رکھتے تھے۔

بحیرہ اس اونٹنی کو کہتے تھے جو پانچ دفعہ بچے جن چکی ہو اور آخری بار اس کے ہاں نر بچہ ہوا ہو۔ اس کا کان چیر کر اُسے آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ پھر نہ کوئی اس پر سوار ہوتا، نہ اس کا دودھ پیا جاتا، نہ اسے ذبح کیا جاتا، نہ اس کا اون اُتارا جاتا۔ اُسے حق تھا کہ جس کھیت اور جس چراگاہ میں چاہے چرے اور جس گھاٹ سے چاہے پانی پیے۔

سائبہ اس اُونٹ یا اونٹنی کو کہتے تھے جسے کسی منّت کے پورا ہونے یا کسی بیماری سے شفا پانے یا کسی خطرے سے بچ جانے پر بطورِ شکرانہ کے پُن کر دیا گیا ہو۔ نیز جس اونٹنی نے دس مرتبہ بچے دیے ہوں اور ہر بار مادہ ہی جنی ہو اسے بھی آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔

وصیلہ۔ اگر بکری کا پہلا بچہ نر ہوتا تو وہ خداؤں کے نام پر ذبح کر دیا جاتا اور اگر وہ پہلی بار مادہ جنتی تو اسے اپنے لیے رکھ لیا جاتا تھا لیکن اگر نر اور مادہ ایک ساتھ پیدا ہوتے تو نر کو ذبح کرنے کے بجائے یونہی خداؤں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا تھا اور اس کا نام وصیلہ تھا۔

حام۔ اگر کسی اونٹ کا پوتا سواری دینے کے قابل ہو جاتا تو اُس بوڑھے اونٹ کو آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ نیز اگر کسی اونٹ کے نطفہ سے دس بچے پیدا ہو جاتے تو اسے بھی آزادی مل جاتی۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [1] یعنی بجائے اس کے کہ آدمی ہر وقت یہ دیکھتا رہے کہ فلاں کیا کر رہا ہے اور فلاں کے عقیدے میں کیا خرابی ہے اور فلاں کے اعمال میں کیا بُرائی ہے، اسے یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ خود کیا کر رہا ہے۔ اسے فکر اپنے خیالات کی، اپنے اخلاق اور اعمال کی

(باقی اگلے صفحہ پر)

وہ خدا کی قسم کھا کر کہیں کہ "ہم کسی ذاتی فائدے کے عوض شہادت بیچنے والے نہیں ہیں، اور خواہ کوئی ہمارا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو (ہم اس کی رعایت کرنے والے نہیں) اور نہ خدا واسطے کی گواہی کو ہم چھپانے والے ہیں، اگر ہم نے ایسا کیا تو گناہ گاروں میں شمار ہوں گے"۔ لیکن اگر پتہ چل جائے کہ ان دونوں نے اپنے آپ کو گناہ میں مبتلا کیا ہے تو پھر ان کی جگہ دو اور شخص اُن لوگوں میں سے کھڑے ہوں جن کا حق پہلے دو گواہوں نے مارنا چاہا تھا، اور وہ خدا کی قسم کھا کر کہیں کہ "ہماری شہادت ان کی شہادت سے زیادہ برحق ہے اور ہم نے اپنی گواہی میں کوئی زیادتی نہیں کی ہے، اگر ہم ایسا کریں تو ظالموں میں سے ہوں گے"۔ اس طریقہ سے زیادہ توقع کی جا سکتی ہے کہ لوگ ٹھیک ٹھیک شہادت دیں گے، یا کم از کم اس بات ہی کا خوف کریں گے کہ ان کی قسموں کے بعد دوسری قسموں سے کہیں ان کی تردید نہ ہو جائے۔ اللہ سے ڈرو اور سنو،
اللہ نافرمانی کرنے والوں کو اپنی رہنمائی سے محروم کر دیتا ہے۔ ع ۱۴

جس روز اللہ[۱۲۶] سب رسولوں کو جمع کر کے پوچھے گا کہ تمہیں کیا جواب دیا گیا،[۱۲۷] تو وہ عرض کریں گے

(بقیہ سابق) ہونی چاہیے کہ وہ کہیں خراب نہ ہوں۔ اگر آدمی خود اللہ کی اطاعت کر رہا ہے، خدا اور بندوں کے جو حقوق اس پر عائد ہوتے ہیں انھیں ادا کر رہا ہے، اور راست روی و راست بازی کے مقتضیات پورے کر رہا ہے، جن میں لازماً امر بالمعروف و نہی عن المنکر بھی شامل ہے، تو یقیناً کسی شخص کی گمراہی و کج روی اس کے لیے نقصان دہ نہیں ہو سکتی۔ اس آیت کا یہ منشا ہرگز نہیں ہے کہ آدمی بس اپنی نجات کی فکر کرے، دوسروں کی اصلاح کی فکر نہ کرے۔ حضرت ابوبکر صدیق اس غلط فہمی کی تردید کرتے ہوئے اپنے ایک خطبہ میں فرماتے ہیں: "لوگو! تم اس آیت کو پڑھتے ہو اور اس کی غلط تاویل کرتے ہو۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب لوگوں کا حال یہ ہو جائے کہ وہ برائی کو دیکھیں اور اسے بدلنے کی کوشش نہ کریں، ظالم کو ظلم کرتے ہوئے پائیں اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو بعید نہیں کہ اللہ اپنے عذاب میں سب کو لپیٹ لے۔ خدا کی قسم تم کو لازم ہے کہ بھلائی کا حکم دو اور برائی سے روکو، ورنہ اللہ تم پر ایسے لوگوں کو مسلط کر دے گا جو تم میں سب سے بدتر ہوں گے اور وہ تم کو سخت تکلیفیں پہنچائیں گے، پھر تمہارے نیک لوگ خدا سے دعائیں مانگیں گے مگر وہ قبول نہ ہوں گی"۔

[۱۲۵] یعنی دیندار، راست باز، اور قابل اعتماد۔

باقی اگلے صفحہ پر

کہ ہمیں کچھ علم نہیں[1]، آپ ہی تمام پوشیدہ حقیقتوں کو جانتے ہیں۔ پھر تصور کرو اس موقع کا جب اللہ فرمائے گا[2] کہ اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! یاد کر میری اس نعمت کو جو میں نے تجھے اور تیری ماں کو عطا کی تھی، میں نے روح پاک سے تیری مدد کی، تو گہوارے میں بھی لوگوں سے بات کرتا تھا اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی، میں نے تجھ کو کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل کی تعلیم دی، تو میرے حکم سے مٹی کا پتلا پرندے کی شکل کا بناتا اور اس میں پھونکتا تھا اور وہ میرے حکم سے پرندہ بن جاتا تھا، تو مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو میرے حکم سے اچھا کرتا تھا، تو مُردوں کو میرے حکم سے نکالتا تھا[3]، پھر جب تو بنی اسرائیل کے پاس صریح نشانیاں لے کر پہنچا اور جو لوگ ان میں سے منکرِ حق تھے انھوں نے کہا کہ یہ نشانیاں جادوگری کے سوا اور کچھ نہیں ہیں، تو میں نے ہی تجھے ان سے بچایا، اور جب میں نے حواریوں کو اشارہ کیا کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ تب انھوں نے کہا کہ ہم ایمان لائے اور گواہ رہو کہ ہم مسلم ہیں[4]"۔۔۔ (حواریوں کے سلسلہ میں) یہ واقعہ بھی یاد رہے کہ جب

(بقیہ سابق) [1] اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے معاملات میں غیر مسلم کو شاہد بنانا صرف اُس حالت میں درست ہے جبکہ کوئی مسلمان گواہ بننے کے لیے میسر نہ آسکے۔

(حواشی صفحہ ۳۴۶) [1] مراد ہے قیامت کا دن۔

[2] یعنی اسلام کی طرف جو دعوت تم نے دنیا کو دی تھی اس کا کیا جواب دنیا نے تمہیں دیا۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [1] یعنی ہم تو صرف اُس محدود ظاہری جواب کو جانتے ہیں جو ہمیں اپنی زندگی میں ملتا ہوا محسوس ہوا۔ باقی رہا یہ کہ فی الحقیقت ہماری دعوت کا ردِعمل کہاں کس صورت میں کتنا ہوا، تو اس کا صحیح علم آپ کے سوا کسی کو نہیں ہو سکتا۔

[2] ابتدائی سوال تمام رسولوں سے بحیثیتِ مجموعی ہوگا، پھر ایک ایک رسول سے الگ الگ شہادت لی جائے گی جیسا کہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر تصریح ارشاد ہوا ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے جو سوال کیا جائے گا وہ یہاں بطورِ خاص نقل کیا جا رہا ہے۔

[3] یعنی حالتِ موت سے نکال کر زندگی کی حالت میں لاتا تھا۔

[4] یعنی حواریوں کا تجھ پر ایمان لانا بھی ہمارے فضل اور توفیق کا نتیجہ تھا، ورنہ تجھ میں تو اتنی (باقی اگلے صفحہ پر)

حواریوں نے کہا اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تمہارا رب ہم پر آسمان سے کھانے کا ایک خوان اُتار سکتا ہے؟ تو عیسیٰ نے کہا اللہ سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔ انھوں نے کہا ہم بس یہ چاہتے ہیں کہ اس خوان سے کھانا کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہوں اور ہمیں معلوم ہو جائے کہ تم نے جو کچھ ہم سے کہا ہے وہ سچ ہے اور ہم اس پر گواہ ہوں۔ اس پر عیسیٰ ابن مریم نے دعا کی خدایا! ہمارے رب! ہم پر آسمان سے ایک خوان نازل کر جو ہمارے لیے، ہمارے اگلوں اور پچھلوں کے لیے خوشی کا موقع قرار پائے اور تیری طرف سے ایک نشانی ہو، ہم کو رزق دے اور تو بہترین رازق ہے۔ اللہ نے جواب دیا میں اس کو تم پر نازل کرنے والا ہوں[لہ]، مگر اس کے بعد جو تم میں سے کفر کرے گا اسے میں ایسی سزا دوں گا جو دنیا میں کسی کو نہ دی ہوگی[۶]۔ غرض جب (یہ واقعات یاد دلاکر) اللہ فرمائے گا کہ "اے عیسیٰ بن مریم! کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے سوا مجھے اور میری ماں کو ع ۱۵

(بقیہ سابق) طاقت بھی نہ تھی کہ اس جھٹلانے والی آبادی میں ایک ہی تصدیق کرنے والا اپنے بل بوتے پر پیدا کر لیتا۔ ضمناً یہاں یہ بھی بتا دیا کہ حواریوں کا اصل دین اسلام تھا نہ کہ عیسائیت۔

ڝ چونکہ حواریوں کا ذکر آ گیا تھا اس لیے سلسلۂ کلام کو توڑ کر جملۂ معترضہ کے طور پر یہاں حواریوں ہی کے متعلق ایک اور واقعہ کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا جس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ مسیح سے براہ راست جن شاگردوں نے تعلیم پائی تھی وہ مسیح کو ایک انسان، محض ایک بندہ سمجھتے تھے اور ان کے وہم و گمان میں بھی اپنے مرشد کے خدا یا شریک خدا یا فرزند خدا ہونے کا تصور نہ تھا۔ نیز یہ کہ مسیح نے خود بھی اپنے آپ کو ان کے سامنے ایک بندۂ بے اختیار کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔

یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ جو گفتگو قیامت کے روز ہونے والی ہے، اس کے اندر اس جملۂ معترضہ کا کونسا موقع تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جملۂ معترضہ اس گفتگو سے متعلق نہیں ہے جو قیامت کے روز ہوگی بلکہ اس کی اُس پیشگی حکایت سے متعلق ہے جو اس دنیا میں کی جا رہی ہے۔ قیامت کی اس ہونے والی گفتگو کا ذکر یہاں کیا ہی اس لیے جا رہا ہے کہ عیسائیوں کو اس سے سبق ملے اور وہ راہِ راست پر آئیں۔ لہٰذا اس گفتگو کے سلسلہ میں حواریوں کے اس واقعہ کا ذکر بطور ایک جملۂ معترضہ کے آنا کسی طرح غیر متعلق نہیں ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) لہ قرآن اس باب میں خاموش ہے کہ یہ خوان فی الواقع اتارا گیا یا نہیں۔ دوسرے کسی معتبر ذریعہ سے بھی اس سوال کا جواب نہیں ملتا۔ ممکن ہے کہ یہ نازل ہوا ہو اور ممکن ہے کہ حواریوں نے بعد کی خوفناک دھمکی سن کر اپنی درخواست واپس لے لی ہو۔

بھی خدا[1] بنالو؟" تو وہ جواب میں عرض کرے گا کہ "سبحان اللہ! میرا یہ کام نہ تھا کہ وہ بات کہتا جس کے کہنے کا مجھے حق نہ تھا، اگر میں نے ایسی بات کہی ہوتی تو آپ کو ضرور علم ہوتا، آپ جانتے ہیں جو کچھ میرے دل میں ہے

---

[1] عیسائیوں نے اللہ کے ساتھ صرف مسیح اور روح القدس ہی کو خدا بنانے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ مسیح کی والدہ حضرت مریم کو بھی ایک مستقل معبود بنا ڈالا۔ حضرت مریم علیہا السلام کی الوہیت یا قدوسیت کے متعلق کوئی اشارہ تک بائیبل میں موجود نہیں ہے۔ مسیح کے بعد ابتدائی تین سو برس تک عیسائی دنیا اس تخیل سے بالکل ناآشنا تھی۔ تیسری صدی عیسوی کے آخری دور میں اسکندریہ کے بعض علماء دینیات نے پہلی مرتبہ حضرت مریم کے لیے "ام اللہ" یا "مادرِ خدا" کے الفاظ استعمال کیے اور اس کے بعد آہستہ آہستہ الوہیت مریم کا عقیدہ اور مریم پرستی کا طریقہ عیسائیوں میں پھیلنا شروع ہوا لیکن اول اول چرچ اسے باقاعدہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا، بلکہ مریم پرستوں کو فاسد العقیدہ قرار دیتا تھا۔ پھر جب نسطوریس کے اس عقیدے پر کہ مسیح کی واحد ذات میں دو مستقل جداگانہ شخصیتیں جمع تھیں، مسیحی دنیا میں بحث و جدال کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا تو اس کا تصفیہ کرنے کے لیے ۴۳۱ء میں شہر افسوس میں ایک کونسل منعقد ہوئی اور اس کونسل میں پہلی مرتبہ کلیسا کی سرکاری زبان میں حضرت مریم کے لیے "مادرِ خدا" کا لقب استعمال کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مریم پرستی کا جو مرض اب تک کلیسا کے باہر پھیل رہا تھا وہ اس کے بعد کلیسا کے اندر بھی تیزی کے ساتھ پھیلنے لگا حتیٰ کہ نزول قرآن کے زمانہ تک پہنچتے پہنچتے حضرت مریم اتنی بڑی دیوی بن گئیں کہ باپ، بیٹے اور روح القدس تینوں ان کے سامنے ہیچ ہوگئے۔ ان کے مجسمے جگہ جگہ کلیساؤں میں رکھے ہوئے تھے، ان کے آگے عبادت کے جملہ مراسم ادا کیے جاتے تھے، انہی سے دعائیں مانگی جاتی تھیں، وہی فریاد رس، حاجت روا، مشکل کشا اور بیکسوں کی پشتیبان تھیں، اور ایک مسیحی بندے کے لیے سب سے بڑا ذریعۂ اعتماد اگر کوئی تھا تو وہ یہ تھا کہ "مادرِ خدا" کی حمایت و سرپرستی اسے حاصل ہو۔ قیصر جسٹینین اپنے ایک قانون کی تمہید میں حضرت مریم کو اپنی سلطنت کا حامی و ناصر قرار دیتا ہے۔ اس کا مشہور جنرل نرسیس میدان جنگ میں حضرت مریم سے ہدایت و رہنمائی طلب کرتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمعصر قیصر ہرقل نے اپنے جھنڈے پر "مادرِ خدا" کی تصویر بنا رکھی تھی اور اسے یقین تھا کہ اس تصویر کی برکت سے یہ جھنڈا سرنگوں نہ ہوگا۔ اگرچہ بعد کی صدیوں میں تحریک اصلاح کے اثر سے پروٹسٹنٹ عیسائیوں نے مریم پرستی کے خلاف شدت سے آواز اٹھائی، لیکن رومن کیتھولک کلیسا آج تک اس مسلک پر قائم ہے۔

اور میں نہیں جانتا جو کچھ آپ کے دل میں ہے، آپ تو ساری پوشیدہ حقیقتوں کے عالم ہیں۔ میں نے ان سے اس کے سوا کچھ نہیں کہا جس کا آپ نے حکم دیا تھا، یہ کہ اللہ کی بندگی کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمھارا رب بھی۔ میں اسی وقت تک ان کا نگراں تھا جب تک کہ میں ان کے درمیان تھا، جب آپ نے مجھے واپس بلا لیا تو آپ ان پر نگراں تھے اور آپ تو ساری ہی چیزوں پر نگراں ہیں۔ اب اگر آپ انھیں سزا دیں تو وہ آپ کے بندے ہیں اور اگر معاف کر دیں تو آپ غالب اور دانا ہیں"۔ تب اللہ فرمائے گا" یہ وہ دن ہے جس میں سچوں کو ان کی سچائی نفع دیتی ہے۔ ان کے لیے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، یہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے، یہی بڑی کامیابی ہے"۔

زمین اور آسمانوں اور تمام موجودات کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

الانعام

(از رکوع ۱ تا ۵)

اس سورہ کے رکوع ۱۶ و ۱۷ میں بعض انعام (مویشیوں) کی حرمت اور بعض کی حلت کے متعلق اہلِ عرب کے توہمات کی تردید کی گئی ہے۔ اسی مناسبت سے اس کا نام الانعام رکھا گیا ہے۔

ابنِ عباس کی روایت ہے کہ یہ پوری سورہ مکہ میں بیک وقت نازل ہوئی تھی۔ اسماء بنت یزید کہتی ہیں کہ جب یہ سورۃ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہو رہی تھی اُس وقت آپ اونٹنی پر سوار تھے، میں اس کی نکیل پکڑے ہوئے تھی، اور بوجھ کے مارے اونٹنی کا یہ حال ہو رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی ہڈیاں اب ٹوٹ جائیں گی۔ روایات میں اس کی بھی تصریح ہے کہ جس رات یہ نازل ہوئی اسی رات کو آپ نے اسے قلمبند کرا دیا۔

اس کے مضامین پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورۃ مکی دَور کے آخری زمانہ میں نازل ہوئی ہوگی۔ حضرت اسماء بنت یزید کی روایت بھی اسی کی تصدیق کرتی ہے، کیونکہ موصوفہ انصار میں سے تھیں اور ہجرت کے بعد ایمان لائیں، اگر قبولِ اسلام سے پہلے محض بربنائے عقیدت وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت

رہی مکہ میں حاضر ہوئی ہوں گی تو یقیناً یہ حاضری آپ کی مکی زندگی کے آخری سال ہی میں ہوئی ہو گی۔ اس سے پہلے اہل یثرب کے ساتھ آپ کے تعلقات اتنے بڑھے ہی نہ تھے کہ وہاں سے کسی عورت کا آپ کی خدمت میں حاضر ہونا ممکن ہوتا۔

زمانۂ نزول متعین ہو جانے کے بعد ہم بآسانی اُس پس منظر کو دیکھ سکتے ہیں جس میں یہ خطبہ ارشاد ہوا ہے۔ اس وقت اللہ کے رسول کو اسلام کی طرف دعوت دیتے ہوئے بارہ سال گذر چکے تھے۔ قریش کی مزاحمت اور ستم گری و جفا کاری انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اسلام قبول کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد ان کے ظلم و ستم سے عاجز آکر ملک چھوڑ چکی تھی اور حبش میں مقیم تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید و حمایت کے لیے نہ ابو طالب باقی رہے تھے اور نہ حضرت خدیجہ، اس لیے ہر دنیوی سہارے سے محروم ہو کر آپ شدید مزاحمتوں کے مقابلہ میں تبلیغ رسالت کا فرض انجام دے رہے تھے۔ آپ کی تبلیغ کے اثر سے مکہ میں اور گرد و نواح کے قبائل میں بھی صالح افراد پے در پے اسلام قبول کرتے جا رہے تھے، لیکن قوم بحیثیت مجموعی ردّ و انکار پر تلی ہوئی تھی اور جہاں کوئی شخص اسلام کی طرف ادنیٰ میلان بھی ظاہر کرتا تھا اسے طعن و ملامت، جسمانی اذیت اور معاشی و معاشرتی مقاطعہ کا ہدف بننا پڑتا تھا۔ اس تاریک ماحول میں صرف ایک ہلکی سی شعاع یثرب کی طرف سے نمودار ہوئی تھی جہاں سے اوس اور خزرج کے بااثر لوگ آکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے اور جہاں کسی اندرونی مزاحمت کے بغیر اسلام پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ مگر اس چھوٹی سی ابتداء میں مستقبل کے جو امکانات پوشیدہ تھے انھیں کوئی ظاہر بین آنکھ نہ دیکھ سکتی تھی۔ بظاہر دیکھنے والوں کو جو کچھ نظر آتا تھا وہ بس یہ تھا کہ اسلام ایک کمزور سی تحریک ہے جس کی پشت پر کوئی مادی طاقت نہیں، جس کا داعی اپنے خاندان کی ضعیف سی حمایت کے سوا کوئی زور نہیں رکھتا، اور جسے قبول کرنے والے چند مٹھی بھر بے بس اور منتشر افراد اپنی قوم کے عقیدہ و مسلک سے منحرف ہو کر اس طرح سوسائٹی سے نکال پھینکے گئے ہیں جیسے پتّے اپنے درخت سے جھڑ کر زمین پر پھیل جائیں۔

ان حالات میں یہ خطبہ ارشاد ہوا ہے اور اس کے مضامین کو سات بڑے بڑے عنوانات پر تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) شرک کا ابطال اور عقیدۂ توحید کی طرف دعوت،

(۲) عقیدۂ آخرت کی تبلیغ اور اس غلط خیال کی تردید کہ زندگی جو کچھ ہے بس یہی دنیا کی زندگی ہے،

(۳) جاہلیت کے اُن توہمات کی تردید جس میں لوگ مبتلا تھے،

(۴) ان بڑے بڑے اصولِ اخلاق کی تلقین جن پر اسلام سوسائٹی کی تعمیر چاہتا تھا،

(۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوت کے خلاف لوگوں کے اعتراضات کا جواب،

(۶) طویل جدوجہد کے باوجود دعوت کے نتیجہ خیز نہ ہونے پر آنحضرت اور عام مسلمانوں میں اضطراب اور دل شکستگی کی جو کیفیت پیدا ہو رہی تھی اس پر تسلی،

(۷) منکرین اور مخالفین کو ان کی غفلت و سرشاری اور نادانستہ خودکشی پر نصیحت، تنبیہ اور تہدید۔

لیکن خطبہ کا انداز یہ نہیں ہے کہ ایک ایک عنوان پر الگ الگ یکجا گفتگو کی گئی ہو، بلکہ خطبہ ایک دریا کی روانی کے ساتھ چلتا جاتا ہے اور اس کے دوران میں یہ عنوانات مختلف طریقوں سے بار بار چھڑتے ہیں اور ہر بار ایک نئے انداز سے ان پر گفتگو کی جاتی ہے۔

اللہ کے نام سے جو رحمان اور رحیم ہے

تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے زمین اور آسمان بنائے، روشنی اور تاریکیاں پیدا کیں، پھر بھی جن لوگوں نے دعوتِ حق کو ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ دوسروں کو اپنے رب کا ہمسر ٹھیرا رہے ہیں[۱]۔ وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا[۲] پھر تمھارے لیے زندگی کی ایک مدت مقرر کر دی، اور ایک

---

[۱] یاد رہے کہ مخاطب وہ لوگ ہیں جو اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ زمین و آسمان کا خالق اللہ ہے، وہی دن نکالتا اور رات لاتا ہے اور اُسی نے آفتاب و ماہتاب کو وجود بخشا ہے۔ ان میں سے کسی کا یہ عقیدہ نہ تھا کہ یہ کام لات، یا ہبل یا عزّیٰ یا کسی اور دیوی یا دیوتا کے ہیں۔ اس لیے ان کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ نادانو! جب تم خود یہ مانتے ہو کہ زمین و آسمان کا خالق اور گردشِ لیل و نہار کا فاعل اللہ ہے تو یہ دوسرے کون ہوتے ہیں کہ ان کے سامنے سجدے کرتے ہو، نذریں اور نیازیں چڑھاتے ہو، دعائیں مانگتے ہو اور اپنی حاجتیں پیش کرتے ہو۔

رب کا ہمسر ٹھیرانے سے مراد یہ ہے کہ اللہ کی صفات میں سے کوئی صفت کسی دوسرے کی طرف (باقی اگلے صفحہ پر)

دوسری مدت اور بھی ہے جو اس کے ہاں طے شدہ ہے۱؎ مگر تم لوگ ہو کہ شک میں پڑے ہوئے ہو۔ وہی ایک خدا آسمانوں میں بھی ہے اور زمین میں بھی، تمہارے کھلے اور چھپے سب حال جانتا ہے اور جو بُرائی یا بھلائی تم کماتے ہو اس سے خوب واقف ہے۔

لوگوں کا حال یہ ہے کہ ان کے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی ایسی نہیں جو ان کے سامنے آئی ہو اور انھوں نے اس سے منہ نہ موڑ لیا ہو، چنانچہ اب جو حق ان کے پاس آیا تو اسے بھی انھوں نے جھٹلا دیا۔ اچھا جس چیز کا وہ اب تک مذاق اڑاتے رہے ہیں عنقریب اس کے متعلق کچھ خبریں انھیں پہنچیں گی۲؎۔ کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ ان سے پہلے کتنی ایسی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں جن کا اپنے اپنے زمانہ میں دور دورہ رہا ہے؟ ان کو ہم نے زمین میں وہ اقتدار بخشا تھا جو تمھیں نہیں بخشا ہے، ان پر ہم نے آسمان سے خوب بارشیں برسائیں اور ان کے نیچے نہریں بہا دیں، (مگر جب انھوں نے کفرانِ نعمت کیا تو) آخر کار ہم نے ان کے گناہوں کی پاداش میں انھیں تباہ کر دیا اور ان کی جگہ دوسرے دور کی قوموں کو اٹھایا۔

(بقیہ سابق) منسوب کی جائے اور اللہ کے جو حقوق اپنے بندوں پر واجب ہیں ان میں سے کوئی حق کسی دوسرے کو ادا کیا جائے۔

روشنی کے مقابلہ میں تاریکیوں کو بصیغۂ جمع بیان کیا گیا، کیونکہ تاریکی نام ہے عدمِ نور کا اور عدمِ نور کے بے شمار مدارج ہیں۔ اس لیے نور واحد ہے اور تاریکیاں بہت ہیں۔

؎ انسانی جسم کے تمام اجزا زمین سے حاصل ہوتے ہیں، کوئی ایک ذرہ بھی اس میں غیر ارضی نہیں ہے، اس لیے فرمایا کہ تم کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۱؎ یعنی قیامت کی گھڑی جب کہ تمام اگلے پچھلے انسان از سرِ نو زندہ کیے جائیں گے اور حساب دینے کے لیے اپنے رب کے سامنے حاضر ہوں گے۔

۲؎ اشارہ ہے ہجرت اور اُن کامیابیوں کی طرف جو ہجرت کے بعد اسلام کو پے در پے حاصل ہونے والی تھیں جس وقت یہ اشارہ فرمایا گیا تھا اُس وقت نہ کفار یہ گمان کر سکتے تھے کہ کس قسم کی خبریں انھیں پہنچنے والی ہیں اور نہ مسلمانوں (باقی اگلے صفحہ پر)

اے پیغمبر! اگر ہم تمہارے اوپر کوئی کاغذ میں لکھی لکھائی کتاب بھی اُتار دیتے اور لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چھوکر بھی دیکھ لیتے تب بھی جنھوں نے حق کا انکار کیا ہے وہ یہی کہتے کہ یہ تو صریح جادو ہے۔ کہتے ہیں اس نبی پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اُتارا گیا۔[۱] اگر کہیں ہم نے فرشتہ اُتار دیا ہوتا تو اب تک کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا، پھر انھیں کوئی مہلت نہ دی جاتی۔[۲] اور اگر ہم وہ اترنے والا کوئی فرشتہ مقرر کرتے تب بھی اسے انسان ہی بناتے اور اِس طرح اِنھیں اُسی شبہ میں مبتلا کر دیتے جس میں اب یہ مبتلا ہیں۔[۳]

(بقیہ سابق) ہی کے ذہن میں اس کا کوئی تصور تھا۔ بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی آئندہ کے امکانات سے بے خبر تھے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۱] یعنی جب یہ شخص خدا کی طرف سے پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہے تو آسمان سے ایک فرشتہ اترنا چاہیے تھا جو لوگوں سے کہتا کہ یہ خدا کا پیغمبر ہے، اس کی بات مانو ورنہ تمھیں سزا دی جائے گی۔ جاہل معترضین کو اس بات پر تعجب تھا کہ بھلا خالق ارض وسما کسی کو پیغمبر مقرر کرے اور پھر اس طرح اسے بے یار و مددگار پتھر کھانے اور گالیاں سننے کے لیے چھوڑ دے۔ اتنے بڑے بادشاہ کا سفیر اگر کسی بڑے اسٹاف کے ساتھ نہ آیا تھا تو کم از کم ایک فرشتہ تو اس کی اردلی میں رہنا چاہیے تھا تاکہ وہ اس کی حفاظت کرتا، اس کا رعب بٹھاتا، اس کی ماموریت کا یقین دلاتا اور فوق الفطری طریقے سے اس کے کام انجام دیتا۔

[۲] یہ ان کے اعتراض کا پہلا جواب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان لانے اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لینے کے لیے جو مہلت تمھیں ملی ہوئی ہے یہ اُسی وقت تک ہے جب تک حقیقت پردۂ غیب میں پوشیدہ ہے، ورنہ جہاں غیب کا پردہ چاک ہوا، پھر مہلت کا کوئی موقع باقی نہ رہے گا، اس کے بعد تو صرف حساب ہی لینا باقی رہ جائے گا۔ اس لیے کہ دنیا کی زندگی تمھارے لیے ایک امتحان کا زمانہ ہے اور امتحان اس امر کا ہے کہ تم حقیقت کو دیکھے بغیر عقل و فکر کے صحیح استعمال سے اس کا ادراک کرتے ہو یا نہیں، اور ادراک کرنے کے بعد اپنے نفس اور اس کی خواہشات کو قابو میں لا کر اپنے عمل کو حقیقت کے مطابق درست رکھتے ہو یا نہیں۔ اس امتحان کے لیے غیب کا غیب رہنا شرط لازم ہے، اور تمھاری دنیوی زندگی، جو دراصل مہلتِ امتحان ہے، اُسی وقت تک قائم رہ سکتی ہے جب تک غیب، غیب ہے۔ جہاں غیب شہادت میں تبدیل ہوا، یہ مہلت لازماً ختم ہو جائے گی اور امتحان کے بجائے نتیجۂ امتحان نکلنے کا وقت آ پہنچے گا۔ لہٰذا تمھارے مطالبہ کے جواب میں یہ ممکن نہیں ہے کہ تمھارے سامنے فرشتے کو اس کی اصلی صورت میں نمایاں کر دیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ ابھی تمھارے امتحان کی مدت ختم

(باقی اگلے صفحہ پر)

اے محمد! تم سے پہلے بھی بہت سے رسولوں کا مذاق اُڑایا جا چکا ہے، مگر ان مذاق اُڑانے والوں پر آخر کار وہی حقیقت مسلط ہو کر رہی جس کا وہ مذاق اُڑاتے تھے۔ ان سے کہو، ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھو جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا ہے۔[۱۱] ع

ان سے پوچھو، آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ کس کا ہے؟ —— کہو سب کچھ اللہ ہی کا ہے۔[۱۲] اس نے رحم و کرم کا شیوہ اپنے اوپر لازم کر لیا ہے (اسی لیے وہ نافرمانیوں اور سرکشیوں پر تمہیں جلدی سے نہیں پکڑ لیتا)، قیامت کے روز وہ تم سب کو ضرور جمع کرے گا، یہ بالکل ایک غیر مشتبہ حقیقت ہے، مگر جن لوگوں نے اپنے آپ کو خود تباہی کے خطرے میں مبتلا کر لیا ہے وہ اسے نہیں مانتے۔

رات کے اندھیرے اور دن کے اجالے میں جو کچھ ٹھیرا ہوا ہے، سب اللہ کا ہے اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔ کہو، اللہ کو چھوڑ کر کیا میں کسی اور کو اپنا سرپرست بنا لوں؟ اُس خدا کو چھوڑ کر جو زمین و آسمان

(بقیہ سابق) نہیں کرنا چاہتا۔

۱۰ یہ ان کے اعتراض کا دوسرا جواب ہے۔ فرشتے کے آنے کی پہلی صورت یہ ہو سکتی تھی کہ وہ لوگوں کے سامنے اپنی اصلی غیبی صورت میں ظاہر ہو۔ لیکن اوپر بتا دیا گیا کہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ اب دوسری صورت باقی رہ گئی یعنی یہ کہ وہ انسانی صورت میں آئے۔ اس کے متعلق فرمایا جا رہا ہے کہ اگر وہ انسانی صورت میں آئے تو اس کے مامور من اللہ ہونے میں بھی تم کو وہی اشتباہ پیش آئے گا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مامور من اللہ ہونے میں پیش آ رہا ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۱۱ یعنی گذری ہوئی قوموں کے آثار قدیمہ اور ان کے تاریخی افسانے شہادت دیں گے کہ صداقت و حقیقت سے منہ موڑنے اور باطل پرستی پر اصرار کرنے کی بدولت کس طرح یہ قومیں عبرتناک انجام سے دوچار ہوئیں۔

۱۲ یہ ایک عجیب انداز بیان ہے۔ پہلے حکم ہوا کہ ان سے پوچھو، زمین و آسمان کی موجودات کس کی ہیں۔ سائل نے سوال کیا اور جواب کے انتظار میں ٹھیر گیا۔ مخاطب اگرچہ خود قائل ہیں کہ سب کچھ اللہ کا ہے لیکن نہ تو وہ غلط جواب دینے کی جرأت رکھتے ہیں، اور نہ صحیح جواب دینا چاہتے ہیں، کیونکہ اگر صحیح جواب دیتے ہیں تو انہیں خوف ہے کہ مخالف اس سے ان کے شرکیہ عقیدے کے خلاف استدلال کرے گا۔ اس لیے وہ کچھ جواب نہیں دیتے۔ تب حکم ہوتا ہے کہ تم خود ہی کہو سب کچھ اللہ کا ہے۔

کا خالق ہے اور جو روزی دیتا ہے روزی لیتا نہیں ہے[۱]؟ کہو، مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں اس کے آگے سرِ تسلیم خم کروں (اور تاکید کی گئی ہے کہ کوئی شرک کرتا ہے تو کرے) تو بہر حال مشرکوں میں شامل نہ ہو۔ کہو، اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو ڈرتا ہوں کہ ایک بڑے (خوفناک) دن مجھے سزا بھگتنی پڑے گی۔ اس دن جو سزا سے بچ گیا اس پر اللہ نے بڑا ہی رحم کیا اور یہی نمایاں کامیابی ہے۔ اگر اللہ تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچائے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو تمہیں اس نقصان سے بچا سکے، اور اگر وہ تمہیں کسی بھلائی سے بہرہ مند کرے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ اپنے بندوں پر کامل اختیارات رکھتا ہے اور دانا اور باخبر ہے۔

ان سے پوچھو کس کی گواہی سب سے بڑھ کر ہے؟ — کہو، میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ ہے[۲]، اور یہ قرآن میری طرف بذریعہ وحی بھیجا گیا ہے تاکہ تمہیں اور جس جس کو یہ پہنچے، سب کو متنبہ کر دوں۔ کیا واقعی تم لوگ یہ شہادت دے سکتے ہو کہ اللہ کے ساتھ دوسرے خدا بھی ہیں[۳]؟ کہو، میں تو اس کی شہادت ہرگز نہیں دے سکتا[۴]۔ کہو، خدا تو وہی ایک ہے اور میں اس شرک سے قطعی بیزار ہوں جس میں تم مبتلا ہو۔ جن لوگوں

---

[۱] اس میں ایک لطیف تعریض ہے۔ مشرکوں نے اللہ کے سوا جن جن کو اپنا خدا بنا رکھا ہے وہ سب اپنے ان بندوں کو رزق دینے کے بجائے اُلٹا ان سے رزق پانے کے محتاج ہیں۔ کوئی فرعون خدائی کے ٹھاٹھ نہیں جما سکتا جب تک اس کے بندے اسے ٹیکس اور نذرانے نہ دیں۔ کسی صاحب قبر کی شان معبودیت قائم نہیں ہو سکتی جب تک اس کے پرستار اس کا مقبرہ تعمیر نہ کریں۔ کسی دیوتا کا دربار خداوندی سج نہیں سکتا جب تک اس کے پجاری اس کا مجسمہ بنا کر کسی شاندار مندر میں نہ رکھیں اور اس کو تزئین و آرائش کے سامانوں سے آراستہ نہ کریں۔ سارے بناوٹی خدا بیچارے خود اپنے بندوں کے محتاج ہیں۔ صرف ایک خداوند عالم ہی وہ حقیقی خدا ہے جس کی خدائی آپ اپنے بل بوتے پر قائم ہے اور جو کسی کی مدد کا محتاج نہیں بلکہ سب اسی کے محتاج ہیں۔

[۲] یعنی اس بات پر گواہ ہے کہ میں اس کی طرف سے مامور ہوں اور جو کچھ کہہ رہا ہوں اسی کے حکم سے کہہ رہا ہوں۔

[۳] کسی چیز کی شہادت دینے کے لیے محض قیاس یا گمان کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے علم ہونا (باقی اگلے صفحہ پر)

کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس بات کو اس طرح غیر مشتبہ طور پر پہچانتے ہیں؎ جیسے ان کو اپنے بیٹوں کے پہچاننے میں کوئی اشتباہ پیش نہیں آتا؎، مگر جنھوں نے اپنے آپ کو خود خسارے میں ڈال دیا ہے وہ اسے نہیں مانتے۔ اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹا بہتان لگائے؎، یا اللہ کی نشانیوں کو جھٹلائے؎؟ یقیناً ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔

جس روز ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے اور مشرکوں سے پوچھیں گے کہ اب وہ تمھارے ٹھیرائے ہوئے شریک کہاں ہیں جن کو تم اپنا الٰہ سمجھتے تھے تو وہ اس کے سوا کوئی فتنہ نہ اٹھا سکیں گے کہ (یہ جھوٹا بیان دیں کہ) اے ہمارے آقا! تیری قسم ہم ہرگز مشرک نہ تھے۔ دیکھا اُس وقت یہ کس طرح اپنے اوپر آپ جھوٹ گھڑیں گے، اور وہاں اُن کے سارے بناوٹی معبود گُم ہو جائیں گے۔

(بقیہ سابق) ضروری ہے جس کی بنا پر آدمی یقین کے ساتھ یہ کہہ سکے کہ ایسا ہے۔ پس سوال کا مطلب یہ ہے کہ کیا واقعی تمھیں یہ علم ہے کہ اس جہان ہست و بود میں خدا کے سوا اور بھی کوئی کارفرما کم ذی اختیار ہے جو بندگی و پرستش کا مستحق ہو؟

؎ یعنی اگر تم علم کے بغیر محض جھوٹی شہادت دینا چاہتے ہو تو دو، میں تو ایسی شہادت نہیں دے سکتا۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) ؎ یعنی کتب آسمانی کا علم رکھنے والے اس حقیقت کو غیر مشتبہ طور پر پہچانتے ہیں کہ خدا ایک ہی ہے اور خدائی میں کسی کا کچھ حصہ نہیں ہے۔

؎ یعنی جس طرح کسی کا بچہ بہت سے بچوں میں ملا جلا کھڑا ہو تو وہ الگ پہچان لے گا کہ اس کا بچہ کون سا ہے، اسی طرح جو شخص کتاب الٰہی کا علم رکھتا ہے وہ الوہیت کے متعلق لوگوں کے بے شمار مختلف عقیدوں اور نظریوں کے درمیان بلا کسی شک و اشتباہ کے یہ پہچان لیتا ہے کہ ان میں امر حق کونسا ہے۔

؎ یعنی یہ دعویٰ کرے کہ خدا کے ساتھ دوسری بہت سی ہستیاں بھی خدائی میں شریک ہیں، خدائی صفات سے متصف ہیں، خداوندانہ اختیارات رکھتی ہیں، اور اس کی مستحق ہیں کہ انسان ان کے آگے عبدیت کا رویہ اختیار کرے۔ نیز یہ بھی اللہ پر بہتان ہے کہ کوئی یہ کہے کہ خدا نے فلاں فلاں ہستیوں کو اپنا مقرب خاص قرار دیا ہے اور اُسی نے یہ حکم دیا ہے، یا کم از کم یہ کہ وہ اس پر راضی ہے کہ ان کی طرف خدائی صفات منسوب کی جائیں اور ان سے وہ معاملہ کیا جائے جو بندے کو (باقی اگلے صفحہ پر)

اِن میں سے بعض لوگ ایسے ہیں جو کان لگا کر تمھاری بات سنتے ہیں مگر حال یہ ہے کہ ہم نے اُن کے دلوں پر پردے ڈال رکھے ہیں جن کی وجہ سے وہ اس کو کچھ نہیں سمجھتے اور ان کے کانوں میں گرانی ہے (کہ سب کچھ سننے پر بھی کچھ نہیں سنتے)۔ وہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں، اس پر ایمان لا کر نہ دیں گے۔ حد یہ ہے کہ جب وہ تمھارے پاس آکر تم سے جھگڑتے ہیں تو ان میں سے جن لوگوں نے انکار کا فیصلہ کر لیا ہے وہ (ساری باتیں سننے کے بعد) یہی کہتے ہیں کہ یہ ایک داستان پارینہ کے سوا کچھ نہیں۔ وہ اس امرِ حق کو قبول کرنے سے لوگوں کو روکتے ہیں اور خود بھی اس سے دور بھاگتے ہیں، (وہ سمجھتے ہیں کہ اس حرکت سے وہ تمھارا

(بقیہ سابق) اپنے خدا کے ساتھ کرنا چاہیے۔

۱۰؎ اللہ کی نشانیوں سے مراد وہ نشانیاں بھی ہیں جو انسان کے اپنے نفس اور ساری کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں اور وہ بھی جو پیغمبروں کی سیرت اور ان کے کارناموں میں ظاہر ہوئیں، اور وہ بھی جو کتبِ آسمانی میں پیش کی گئیں۔ یہ ساری نشانیاں ایک ہی حقیقت کی طرف رہنمائی کرتی ہیں یعنی یہ کہ موجوداتِ عالم میں خدا صرف ایک ہے باقی سب بندے ہیں۔ اب جو شخص ان تمام نشانیوں کے مقابلہ میں کسی حقیقی شہادت کے بغیر، کسی علم، کسی مشاہدے اور کسی تجربے کے بغیر، مجرد قیاس و گمان یا تقلیدِ آبائی کی بنا پر دوسروں کو الوہیت کی صفات سے متصف اور خداوندی حقوق کا مستحق ٹھیراتا ہے، ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ حقیقت و صداقت پر ظلم کر رہا ہے، اپنے نفس پر ظلم کر رہا ہے، اور کائنات کی ہر اس چیز پر ظلم کر رہا ہے جس کے ساتھ وہ اس غلط نظریہ کی بنا پر کوئی معاملہ کرتا ہے۔

(حواشی صفحۂ ہذا) ۱۷؎ یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ قانونِ فطرت کے تحت جو کچھ دنیا میں واقع ہوتا ہے اسے اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب فرماتا ہے، کیونکہ دراصل اس قانون کا بنانے والا اللہ ہی ہے اور جو نتائج اس قانون کے تحت رونما ہوتے ہیں وہ سب حقیقت میں اللہ کے اذن و ارادہ کے تحت ہی رونما ہوا کرتے ہیں۔ ہٹ دھرم منکرینِ حق کا سب کچھ سننے پر بھی کچھ نہ سننا اور داعیِ حق کی کسی بات کا ان کے دل میں نہ اترنا ان کی ہٹ دھرمی اور تعصب اور جمود کا فطری نتیجہ ہے۔ قانونِ فطرت یہی ہے کہ جو شخص ضد پر اتر آتا ہے اور بے تعصبی کے ساتھ صداقت پسند انسان کا سا رویہ اختیار کرنے پر تیار نہیں ہوتا، اس کے دل کے دروازے ہر اس صداقت کے لیے بند ہو جاتے ہیں جو اس کی خواہشات کے خلاف ہوں۔ اس بات کو جب ہم بیان (باقی اگلے صفحہ پر

کچھ بگاڑ رہے ہیں) حالانکہ دراصل وہ خود اپنی ہی تباہی کا سامان کر رہے ہیں مگر انھیں اس کا شعور نہیں ہے۔ کاش تم اس وقت کی حالت دیکھ سکتے جب وہ دوزخ کے کنارے کھڑے کیے جائیں گے۔ اس وقت وہ کہیں گے کہ کاش کوئی صورت ایسی ہو کہ ہم دنیا میں پھر واپس بھیجے جائیں اور اپنے رب کی نشانیوں کو نہ جھٹلائیں اور ایمان لانے والوں میں شامل ہوں۔ درحقیقت یہ بات وہ محض اس وجہ سے کہیں گے کہ جس حقیقت پر انھوں نے پردہ ڈال رکھا تھا وہ اس وقت بے نقاب ہو کر ان کے سامنے آچکی ہوگی،[۱] ورنہ اگر انھیں سابق زندگی کی طرف واپس بھیجا جائے تو پھر وہی سب کچھ کریں جس سے انھیں منع کیا گیا ہے، وہ تو ہیں ہی جھوٹے (اس لیے اپنی اس خواہش کے اظہار میں بھی جھوٹ ہی سے کام لیں گے)۔ آج یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی جو کچھ بھی ہے بس یہی دنیا کی زندگی ہے اور ہم مرنے کے بعد ہرگز دوبارہ نہ اُٹھائے جائیں گے۔ کاش وہ منظر تم دیکھ سکو جب یہ اپنے رب کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے۔ اس وقت ان کا رب ان سے پوچھے گا "کیا یہ حقیقت نہیں ہے؟" یہ کہیں گے "ہاں اے ہمارے رب! یہ حقیقت ہی ہے"۔ وہ فرمائے گا "اچھا! تو اب

(بقیہ سابق) کریں گے تو یوں کہیں گے کہ فلاں شخص کے دل کے دروازے بند ہیں۔ اور اسی بات کو جب اللہ بیان فرمائے گا تو یوں فرمائے گا کہ اس کے دل کے دروازے ہم نے بند کر دیے ہیں۔ کیونکہ ہم صرف واقعہ بیان کرتے ہیں اور اللہ حقیقتِ واقعہ کا اظہار فرماتا ہے۔

[۱] نادان لوگوں کا ہمیشہ یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص انھیں حق کی طرف دعوت دیتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ تم نے نئی بات کیا کہی، یہ تو سب وہی پرانی باتیں ہیں جو ہم پہلے سے سنتے چلے آرہے ہیں۔ گویا ان احمقوں کا نظریہ یہ ہے کہ کسی بات کے حق ہونے کے لیے اس کا نیا ہونا بھی ضروری ہے اور جو بات پرانی ہے وہ حق نہیں ہے۔ حالانکہ حق ہر زمانے میں ایک ہی رہا ہے اور ہمیشہ ایک ہی رہے گا۔ خدا کے دیے ہوئے علم کی بنا پر جو لوگ انسانوں کی رہنمائی کے لیے آگے بڑھے ہیں وہ سب قدیم ترین زمانہ سے ایک ہی امرِ حق کو پیش کرتے آئے ہیں اور آئندہ بھی جو اس منبع علم سے فائدہ اٹھا کر کچھ پیش کرے گا وہ اسی پرانی بات کو دہرائے گا۔ البتہ نئی بات صرف وہی لوگ نکال سکتے ہیں جو خدا کی روشنی سے محروم ہو کر ازلی و ابدی حقیقت کو نہیں دیکھ سکتے اور اپنے ذہن کی اُپج سے کچھ نظریات گھڑ کر انھیں حق کے نام سے پیش کرتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ بلاشبہ (باقی اگلے صفحہ پر)

اپنے انکارِ حقیقت کی پاداش میں عذاب کا مزا چکھو۔ ع

نقصان میں پڑ گئے وہ لوگ جنھوں نے اللہ سے اپنی ملاقات کی اطلاع کو جھوٹ قرار دیا جب اچانک وہ گھڑی آجائے گی تو یہی لوگ کہیں گے "افسوس! ہم سے اس معاملہ میں کیسی تقصیر ہوئی" اور ان کا حال یہ ہوگا کہ اپنی پیٹھوں پر اپنے گناہوں کا بوجھ لادے ہوئے ہوں گے۔ دیکھو! کیسا بڑا بوجھ ہے جو یہ اُٹھا رہے ہیں۔ دنیا کی زندگی تو ایک کھیل اور ایک تماشا ہے[1]۔ حقیقت میں آخرت ہی کا مقام اُن لوگوں کے لیے بہتر ہے جو زیاں کاری سے بچنا چاہتے ہیں، پھر کیا تم لوگ عقل سے کام نہ لوگے؟

(بقیہ سابق) ایسے نادرہ کار ہو سکتے ہیں کہ وہ بات کہیں جو اُن سے پہلے کبھی دنیا میں کسی نے نہ کہی ہو۔

(حاشیہ صفحہ ۳۴۹) [1] یعنی ان کا یہ قول درحقیقت عقل و فکر کے کسی صحیح فیصلے اور کسی حقیقی تبدیلی رائے کا نتیجہ نہ ہوگا بلکہ محض مشاہدۂ حق کا نتیجہ ہوگا جس کے بعد ظاہر ہے کہ کوئی کٹے سے کٹا کافر بھی انکار کی جرأت نہیں کر سکتا۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] اس کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا کی زندگی میں کوئی سنجیدگی نہیں ہے اور یہ محض کھیل اور تماشے کے طور پر بنائی گئی ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آخرت کی حقیقی و پائیدار زندگی کے مقابلہ میں یہ زندگی ایسی ہے جیسے کوئی شخص کچھ دیر کھیل اور تفریح میں دل بہلائے اور پھر اصل سنجیدہ کاروبار کی طرف واپس ہو جائے۔ نیز اسے کھیل اور تماشے سے تشبیہ اس لیے بھی دی گئی ہے کہ یہاں حقیقت کے مخفی ہونے کی وجہ سے بے بصیرت اور ظاہر پرست انسانوں کے لیے غلط فہمیوں میں مبتلا ہونے کے بہت سے اسباب موجود ہیں اور ان غلط فہمیوں میں پھنس کر لوگ حقیقتِ نفس الامری کے خلاف ایسے ایسے عجیب طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں جن کی بدولت ان کی زندگی محض ایک کھیل اور تماشا بن کر رہ جاتی ہے۔ مثلاً جو شخص یہاں بادشاہ بن کر بیٹھتا ہے اس کی حیثیت حقیقت میں تھیٹر کے اُس مصنوعی بادشاہ سے مختلف نہیں ہوتی جو تاج پہن کر جلوہ افروز ہوتا ہے اور اس طرح حکم چلاتا ہے گویا کہ وہ واقعی بادشاہ ہے، حالانکہ حقیقی بادشاہی کی اس کو ہوا تک نہیں لگی ہوتی، ڈائرکٹر کے ایک اشارے پر وہ معزول ہو جاتا ہے، قید کیا جاتا ہے اور اس کے قتل تک کا فیصلہ صادر ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی تماشے اس دنیا میں ہر طرف ہو رہے ہیں۔ کہیں کسی ولی یا دیوی کے دربار سے حاجت روائیاں ہو رہی ہیں، حالانکہ وہاں حاجت روائی کی طاقت کا نام و نشان تک موجود نہیں۔ کہیں کوئی غیب دانی کے کمالات کا مظاہرہ کر رہا ہے، حالانکہ غیب کے علم کا وہاں شائبہ تک نہیں۔ کہیں کوئی لوگوں کا رزاق بنا ہوا ہے، حالانکہ بیچارہ خود اپنے رزق (باقی اگلے صفحہ پر)

اے محمدؐ! ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان سے تمہیں رنج ہوتا ہے، لیکن دراصل یہ لوگ تمہیں نہیں جھٹلاتے بلکہ ظالم اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں۔ تم سے پہلے بھی بہت سے رسول

(بقیہ سابق) کے لیے کسی اور کا محتاج ہے۔ کہیں کوئی اپنے آپ کو عزت اور ذلت دینے والا، نفع اور نقصان پہنچانے والا سمجھے بیٹھا ہے اور یوں اپنی کبریائی کے ڈنکے بجا رہا ہے گویا وہ گرد و پیش کی ساری مخلوق کا خدا ہے، حالانکہ بندگی کی ذلت کا داغ اس کی پیشانی پر لگا ہوا ہے اور قسمت کا ایک ذرا سا جھٹکا اسے کبریائی کے مقام سے گرا کر انہی لوگوں کے قدموں میں پامال کرا سکتا ہے جن پر وہ کل تک خدائی کر رہا تھا۔ یہ سب کھیل جو دنیا کی چند روزہ زندگی میں کھیلے جا رہے ہیں، موت کی ساعت آتے ہی یکلخت ختم ہو جائیں گے اور اس سرحد سے پار ہوتے ہی انسان اُس عالم میں پہنچ جائے گا جہاں سب کچھ عین مطابق حقیقت ہوگا اور جہاں دنیوی زندگی کی ساری غلط فہمیوں کے چھلکے اتار کر ہر انسان کو دکھا دیا جائے گا کہ وہ صداقت کا کتنا جوہر اپنے ساتھ لایا ہے جو میزانِ حق میں کسی وزن اور کسی قدر و قیمت کا حامل ہو سکتا ہو۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] واقعہ یہ ہے کہ جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی آیات سنانی شروع کی تھیں، آپ کی قوم کے سب لوگ آپ کو امین اور صادق سمجھتے تھے اور آپ کی راستبازی پر کامل اعتماد رکھتے تھے۔ انھوں نے آپ کو جھٹلایا اُس وقت جبکہ آپ نے اللہ کی طرف سے پیغام پہنچانا شروع کیا۔ اور اس دوسرے دور میں بھی ان کے اندر کوئی شخص ایسا نہ تھا جو شخصی حیثیت سے آپ کو جھوٹا قرار دینے کی جرأت کر سکتا ہو۔ آپ کے سخت سے سخت مخالف نے بھی کبھی آپ پر یہ الزام نہیں لگایا کہ آپ دنیا کے کسی معاملہ میں کبھی جھوٹ بولنے کے مرتکب ہوئے ہیں۔ انھوں نے جتنی آپ کی تکذیب کی وہ محض نبی ہونے کی حیثیت سے کی۔ آپ کا سب سے بڑا دشمن ابوجہل تھا اور حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ خود اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کرتے ہوئے کہا انا لا نکذبک ولکن نکذب ما جئت بہ۔ "ہم آپ کو تو جھوٹا نہیں کہتے، مگر جو کچھ آپ پیش کر رہے ہیں اسے جھوٹ قرار دیتے ہیں"۔ جنگ بدر کے موقع پر اخنس بن شُریق نے تخلیہ میں ابوجہل سے پوچھا کہ یہاں میرے اور تمہارے سوا کوئی تیسرا موجود نہیں، سچ بتاؤ کہ محمدؐ کو تم سچا سمجھتے ہو یا جھوٹا؟ اس نے جواب دیا "خدا کی قسم محمدؐ ایک سچا آدمی ہے، عمر بھر کبھی جھوٹ نہیں بولا، مگر جب لواء، سقایت، حجابت اور نبوت سب کچھ بنی قُصَیّ ہی کے حصہ میں آجائے تو بتاؤ باقی سارے قریش کے پاس کیا رہ گیا؟" اسی بنا پر یہاں اللہ تعالیٰ اپنے نبیؐ کو تسلی دے رہا ہے کہ تکذیب دراصل تمہاری نہیں بلکہ ہماری کی جا رہی ہے اور جب ہم تحمل و بردباری کے ساتھ اسے برداشت کیے جا رہے ہیں اور ڈھیل پر ڈھیل دیے جاتے ہیں تو تم کیوں مضطرب ہوتے ہو۔

جھٹلائے جا چکے ہیں، مگر اس تکذیب پر اور اُن اذیتوں پر جو انھیں پہنچائی گئیں، انھوں نے صبر کیا، یہاں تک کہ انھیں ہماری مدد پہنچ گئی۔ اللہ کی باتوں کو بدلنے کی طاقت کسی میں نہیں ہے[21]، اور پچھلے رسولوں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس کی خبریں تمھیں پہنچ ہی چکی ہیں۔ تاہم اگر ان لوگوں کی بے رُخی تم سے برداشت نہیں ہوتی تو اگر تم میں کچھ زور ہے تو زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈو یا آسمان میں سیڑھی لگاؤ اور ان کے پاس کوئی نشانی لانے کی کوشش کرو[22]۔ اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر سکتا تھا، لہٰذا نادان مت بنو[23]۔ دعوتِ حق پر لبیک وہی لوگ کہتے ہیں جو سننے والے ہیں، رہے مُردے[24]، تو انھیں تو

---

[21] یعنی اللہ نے حق اور باطل کی کشمکش کے لیے جو قانون بنا دیا ہے اسے تبدیل کرنا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ حق پرستوں کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ ایک طویل مدت تک آزمائشوں کی بھٹی میں تپائے جائیں، اپنے صبر کا، اپنی راستبازی کا، اپنے ایثار اور اپنی فداکاری کا، اپنے ایمان کی پختگی اور اپنے توکل علی اللہ کا امتحان دیں، مصائب اور مشکلات کے دور سے گذر کر اپنے اندر وہ صفات پرورش کریں جو صرف اسی دشوار گذار گھاٹی ہی میں پرورش پا سکتی ہیں، اور ابتداءً خالص اخلاق فاضلہ و سیرت صالحہ کے ہتھیاروں سے جاہلیت پر فتح حاصل کر کے دکھائیں۔ اس طرح جب وہ اپنا اصلح ہونا ثابت کر دیں گے تب اللہ کی نصرت ٹھیک اپنے وقت پر ان کی دستگیری کے لیے آ پہنچے گی۔ وقت سے پہلے وہ کسی کے لائے نہیں آ سکتی۔

[22] نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب دیکھتے تھے کہ اس قوم کو سمجھاتے سمجھاتے مدتیں گذر گئی ہیں اور کسی طرح یہ راستی پر نہیں آتی تو بسا اوقات آپ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ کاش کوئی نشانی خدا کی طرف سے ایسی ظاہر ہو جس سے ان لوگوں کا کفر ٹوٹے اور یہ میری صداقت تسلیم کر لیں۔ آپ کی اسی خواہش کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بے صبری سے کام نہ لو۔ جس ڈھنگ اور جس ترتیب و تدریج سے ہم اس کام کو چلوا رہے ہیں اسی پر صبر کے ساتھ چلے جاؤ۔ معجزوں سے کام لینا ہوتا تو کیا ہم خود نہ لے سکتے تھے؟ مگر ہم جانتے ہیں کہ جس فکری و اخلاقی انقلاب اور جس مدنیتِ صالحہ کی تعمیر کے کام پر تم مامور ہوئے ہو اسے کامیابی کی منزل تک پہنچانے کا صحیح راستہ یہ نہیں ہے۔ تاہم اگر لوگوں کے موجودہ جمود اور ان کے انکار کی سختی پر تم سے صبر نہیں ہوتا اور تمھیں گمان ہے کہ اس جمود کو توڑنے کے لیے کسی محسوس نشانی کا مشاہدہ کرانا ہی ضروری ہے تو خود زور لگاؤ اور تمھارا کچھ بس چلتا ہو تو زمین میں گھس کر یا آسمان پر چڑھ کر

(باقی اگلے صفحہ پر)

اللہ بس قبروں ہی سے اٹھائے گا اور پھر وہ (اس کی عدالت میں پیش ہونے کے لیے) واپس لائے جائیں گے

یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس نبی پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتری؟ کہو، اللہ نشانی اُتارنے کی پوری قدرت رکھتا ہے، مگر ان میں سے اکثر لوگ نادانی میں مبتلا ہیں[۲۵]۔ زمین میں چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں پروں سے اُڑنے والے کسی پرندے کو دیکھ لو، یہ سب تمہاری ہی طرح کی انواع ہیں، ہم نے ان کی تقدیر کے نوشتے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے، پھر یہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جاتے ہیں۔ مگر جو لوگ ہماری نشانیوں کو جھٹلاتے ہیں وہ بہرے اور گونگے ہیں تاریکیوں

(بقیہ سابق) کوئی ایسا معجزہ لانے کی کوشش کرو جسے تم سمجھو کہ یہ بے یقینی کو یقین میں تبدیل کر دینے کے لیے کافی ہوگا۔ مگر ہم سے امید نہ رکھو کہ ہم تمہاری یہ خواہش پوری کریں گے کیونکہ ہماری اسکیم میں اس تدبیر کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

[۲۵] یعنی اگر صرف یہی بات مطلوب ہوتی کہ تمام انسان کسی نہ کسی طور پر راست رو بن جائیں تو نبی بھیجنے اور کتابیں نازل کرنے اور مومنوں سے کفار کے مقابلہ میں جدوجہد کرانے اور دعوتِ حق کو تدریجی تحریک کی منزلوں سے گذروانے کی حاجت ہی کیا تھی، یہ کام تو اللہ کے ایک ہی تخلیقی اشارہ سے انجام پا سکتا تھا۔ لیکن اللہ اس کام کو اس طریقہ پر کرنا نہیں چاہتا۔ اس کا منشا تو یہ ہے کہ حق کو دلائل کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے، پھر ان میں سے جو لوگ فکرِ صحیح سے کام لے کر اس حق کو پہچان لیں وہ اپنے آزادانہ اختیار سے اس پر ایمان لائیں، اپنی سیرتوں کو اس کے سانچے میں ڈھال کر باطل پرستوں کے مقابلہ میں اپنا اخلاقی تفوق ثابت کریں، انسانوں کے مجموعہ میں سے صالح عناصر کو اپنے طاقتور استدلال، اپنے بلند نصب العین، اپنے بہتر اصولِ زندگی اور اپنی پاکیزہ سیرت کی کشش سے اپنی طرف کھینچتے چلے جائیں، اور باطل کے خلاف پیہم جدوجہد کر کے فطری ارتقاء کی راہ سے اقامتِ دینِ حق کی منزل تک پہنچیں۔ اللہ اس کام میں ان کی رہنمائی کرے گا اور جس مرحلہ پر جیسی مدد اللہ سے پانے کا وہ اپنے آپ کو مستحق بنائیں گے وہ مدد بھی انہیں دیتا چلا جائے گا۔ لیکن کوئی یہ چاہے کہ اس فطری راستے کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ محض اپنی قوتِ قاہرہ کے زور سے بجبر افکارِ فاسدہ کو مٹا کر لوگوں میں فکرِ صالح پھیلا دے اور تمدنِ فاسدہ کو نیست و نابود کر کے مدنیتِ صالحہ تعمیر کر دے، تو ایسا ہرگز نہ ہوگا کیونکہ (باقی اگلے صفحہ پر)

ہیں پڑے ہوئے ہیں۔[سلہ] اللہ جسے چاہتا ہے بھٹکا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے سیدھے رستے پر لگا دیتا ہے۔[سلہ]

(بقیہ سابق) یہ اللہ کی اس حکمت کے خلاف ہے جس کے تحت اس نے انسان کو دنیا میں ایک ذمہ دار مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا ہے، اسے تصرف کے اختیارات دیے ہیں، طاعت و عصیان کی آزادی بخشی ہے، امتحان کی مہلت عطا کی ہے، اور اس کی سعی کے مطابق جزا اور سزا دینے کے لیے فیصلہ کا ایک وقت مقرر کر دیا ہے۔

سلہ سننے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے ضمیر زندہ ہیں جنھوں نے اپنی عقل و فکر کو معطل نہیں کر دیا ہے، اور جنھوں نے اپنے دل کے دروازوں پر تعصب اور جمود کے قفل نہیں چڑھا دیے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں مردہ وہ لوگ ہیں جو لکیر کے فقیر بنے اندھوں کی طرح چلے جا رہے ہیں اور اس لکیر سے ہٹ کر کوئی بات قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں خواہ وہ صریح حق ہی کیوں نہ ہو۔

(حاشیہ صفحہ ۳۵۳) سلہ نشانی سے مراد محسوس معجزہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ معجزہ نہ دکھائے جانے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہم اس کے دکھانے سے عاجز ہیں بلکہ اس کی وجہ کچھ اور ہے جسے یہ لوگ محض اپنی نادانی سے نہیں سمجھتے

(حواشی صفحہ ہذا) سلہ مطلب یہ ہے کہ اگر تمھیں محض تماشہ بینی کا شوق نہیں ہے بلکہ فی الواقع یہ معلوم کرنے کے لیے نشانی دیکھنا چاہتے ہو کہ یہ نبی جس چیز کی طرف بلا رہا ہے وہ امر حق ہے یا نہیں، تو آنکھیں کھول کر دیکھو، تمھارے گرد و پیش ہر طرف نشانیاں ہی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ زمین کے جانوروں اور ہوا کے پرندوں کی کسی ایک نوع کو لے کر اس کی زندگی پر غور کرو۔ کس طرح اس کی ساخت ٹھیک اس کے مناسب حال بنائی گئی ہے، کس طرح اس کی جبلت میں اس کی فطری ضرورتوں کے عین مطابق قوتیں ودیعت کی گئی ہیں، کس طرح اس کی رزق رسانی کا انتظام ہو رہا ہے، کس طرح اس کی ایک تقدیر مقرر ہے جس کے حدود سے وہ نہ آگے بڑھ سکتی ہے نہ پیچھے ہٹ سکتی ہے، کس طرح ان میں سے ایک ایک جانور اور ایک ایک چھوٹے چھوٹے کیڑے کی اسی مقام پر جہاں وہ ہے، خبر گیری، نگرانی، حفاظت اور رہنمائی کی جا رہی ہے، کس طرح اس سے ایک مقرر اسکیم کے مطابق کام لیا جا رہا ہے، کس طرح اسے ضابطہ کا پابند بنا کر رکھا گیا ہے اور کس طرح اس کی پیدائش، تناسل اور موت کا سلسلہ پوری باقاعدگی کے ساتھ چل رہا ہے۔ اگر خدا کی بے شمار نشانیوں میں سے صرف اسی ایک نشانی پر غور کرو تو تمھیں معلوم ہو جائے کہ خدا کی توحید اور اس کی صفات کا جو تصور یہ پیغمبر تمھارے سامنے پیش کر رہا

(باقی اگلے صفحہ پر)

اِن سے کہو، ذرا غور کر کے بتاؤ، اگر کبھی تم پر اللہ کی طرف سے کوئی بڑی مصیبت آجاتی ہے یا آخری گھڑی آ پہنچتی ہے تو کیا اُس وقت تم اللہ کے سوا کسی اور کو پکارتے ہو؟ بولو اگر تم سچے ہو۔ اُس وقت تم اللہ ہی کو پکارتے ہو، پھر اگر وہ چاہتا ہے تو اس مصیبت کو تم پر سے ٹال دیتا ہے۔ ایسے موقعوں پر تم اپنے ٹھیرائے

(بقیہ سابق) ہے اور اس تصور کے مطابق دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے جس رویّہ کی طرف تمھیں دعوت دے رہا ہے وہ عین حق ہے۔ لیکن تم نہ خود اپنی آنکھیں کھول کر دیکھتے ہو، نہ کسی سمجھانے والے کی بات سنتے ہو، جہالت کی تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہو اور چاہتے ہو کہ عجائب قدرت کے کرشمے دکھا کر تمھارا دل بہلایا جائے۔

سه خدا کا بھٹکانا یہ ہے کہ ایک جہالت پسند انسان کو آیاتِ الٰہی کے مطالعہ کی توفیق نہ بخشی جائے، اور ایک متعصب غیر حقیقت پسند طالب علم اگر آیاتِ الٰہی کا مشاہدہ کرے بھی تو حقیقت رسی کے نشانات اس کی آنکھ سے اوجھل رہیں اور غلط فہمیوں میں اُلجھانے والی چیزیں اسے حق سے دور اور دور تر کھینچتی چلی جائیں۔ بخلاف اس کے اللہ کی ہدایت یہ ہے کہ ایک طالب حق کو علم کے ذرائع سے فائدہ اٹھانے کی توفیق بخشی جائے اور اللہ کی آیات میں اسے حقیقت تک پہنچنے کے نشانات ملتے چلے جائیں۔ ان تینوں کیفیتوں کی بکثرت مثالیں آئے دن ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں۔ بکثرت انسان ایسے ہیں جن کے سامنے آفاق اور انفس میں اللہ کی بے شمار نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں مگر وہ جانوروں کی طرح انھیں دیکھتے ہیں اور کوئی سبق حاصل نہیں کرتے۔ اور بہت سے انسان ہیں جو حیوانیات، نباتیات، جمادات، ارضیات، فلکیات، عضویات، علم التشریح اور سائنس کی دوسری شاخوں کا مطالعہ کرتے ہیں، تاریخ، آثارِ قدیمہ اور علوم اجتماع کی تحقیق کرتے ہیں اور ایسی ایسی نشانیاں ان کے مشاہدے میں آتی ہیں جو قلب کو ایمان سے لبریز کر دیں، مگر چونکہ وہ مطالعہ کا آغاز ہی تعصب کے ساتھ کرتے ہیں اور ان کے پیش نظر دنیا اور اس کے فوائد و منافع کے سوا کچھ نہیں ہوتا اس لیے اس مشاہدہ کے دوران میں ان کو صداقت تک پہنچانے والی کوئی نشانی نہیں ملتی، بلکہ جو نشانی بھی سامنے آتی ہے وہ انھیں اُلٹی دہریت، الحاد، مادہ پرستی اور نیچریت ہی کی طرف کھینچے جاتی ہے۔ ان کے مقابلہ میں ایسے لوگ بھی ناپید نہیں ہیں جو آنکھیں کھول کر اس کارگاہِ عالم کو دیکھتے ہیں اور ان کا حال یہ ہے کہ

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار

ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

ہوئے شریکوں کو بھول جاتے ہو۔[1] ع

تم سے پہلے بہت سی قوموں کی طرف ہم نے رسول بھیجے اور اُن کو مصائب و آلام میں مبتلا کیا تاکہ وہ عاجزی کے ساتھ ہمارے سامنے جھک جائیں۔ پس جب ہماری طرف سے ان پر سختی آئی تو کیوں نہ انھوں نے عاجزی اختیار کی؟ مگر ان کے دل تو اور سخت ہو گئے اور شیطان نے ان کو اطمینان دلایا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو خوب کر رہے ہو۔ پھر جب انھوں نے اس نصیحت کو، جو انھیں کی گئی تھی، بھلا دیا تو ہم نے ہر طرح کی خوشحالیوں کے دروازے ان کے لیے کھول دیے یہاں تک کہ جب وہ ان بخششوں سے جو انھیں عطا کی گئی تھیں خوب مگن ہو گئے تو اچانک ہم نے انھیں پکڑ لیا اور اب حال یہ تھا کہ وہ ہر خیر سے مایوس تھے۔ اس طرح اُن لوگوں کی جڑ

---

[1] گذشتہ آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ تم ایک نشانی کا مطالبہ کرتے ہو اور حال یہ ہے کہ تمھارے گرد و پیش ہر طرف نشانیاں ہی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس سلسلہ میں پہلے مثال کے طور پر حیوانات کی زندگی کے مشاہدہ کی طرف توجہ دلائی گئی۔ اس کے بعد اب ایک دوسری نشانی کی طرف اشارہ فرمایا جا رہا ہے جو خود منکرینِ حق کے اپنے نفس میں موجود ہے۔ جب انسان پر کوئی بڑی آفت آجاتی ہے یا موت اپنی بھیانک صورت کے ساتھ سامنے آکھڑی ہوتی ہے اس وقت ایک خدا کے دامن کے سوا کوئی دوسری پناہ گاہ اُسے نظر نہیں آتی۔ بڑے بڑے مشرک ایسے موقع پر اپنے معبودوں کو بھول کر خدائے واحد کو پکارنے لگتے ہیں۔ کٹّے سے کٹّا دہریہ تک خدا کے آگے دعا کے لیے ہاتھ پھیلا دیتا ہے۔ اسی نشانی کو یہاں حق نمائی کے لیے پیش کیا جا رہا ہے کیونکہ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ خدا پرستی اور توحید کی شہادت ہر انسان کے نفس میں موجود ہے جس پر غفلت و جہالت کے خواہ کتنے ہی پردے ڈال دیے گئے ہوں، مگر پھر بھی کبھی نہ کبھی وہ اُبھر کر سامنے آجاتی ہے۔ ابوجہل کے بیٹے عکرمہ کو اسی نشانی کے مشاہدے سے ایمان کی توفیق نصیب ہوئی۔ جب مکہ معظمہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر فتح ہو گیا تو عکرمہ جدہ کی طرف بھاگے اور ایک کشتی پر سوار ہو کر حبش کی راہ لی۔ راستہ میں سخت طوفان آیا اور کشتی خطرہ میں پڑ گئی۔ اول اول تو دیویوں اور دیوتاؤں کو پکارا جاتا رہا۔ مگر جب طوفان کی شدت بڑھی اور مسافروں کو یقین ہو گیا کہ اب کشتی ڈوب جائے گی تو سب کہنے لگے کہ یہ وقت اللہ کے سوا کسی کو پکارنے کا نہیں ہے، وہی چاہے تو ہم بچ سکتے ہیں۔ اس وقت عکرمہ کی آنکھیں کھلیں اور ان کے دل نے آواز دی کہ اگر یہاں اللہ کے سوا کوئی مددگار نہیں تو کہیں اور کیوں ہو؟ یہی تو

(باقی اگلے صفحہ پر)

کاٹ کر رکھ دی گئی جنھوں نے ظلم کیا تھا اور تعریف ہے اللہ رب العالمین کے لیے (کہ اس نے ان کی جڑ کاٹ دی)

اے محمدؐ! ان سے کہو، کبھی تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ اگر اللہ تمھاری بینائی اور سماعت تم سے چھین لے اور تمھارے دلوں پر مہر کر دے[1] تو اللہ کے سوا کون سا الٰہ ہے جو یہ قوتیں تمھیں واپس دلا سکتا ہو؟ دیکھو کس طرح ہم بار بار اپنی نشانیاں ان کے سامنے پیش کرتے ہیں اور پھر یہ کس طرح ان سے نظر چرا جاتے ہیں۔ کہو، کبھی تم نے سوچا کہ اگر اللہ کی طرف سے اچانک یا علانیہ تم پر عذاب آ جائے تو کیا ظالم لوگوں کے سوا کوئی اور ہلاک ہوگا؟ ہم جو رسول بھیجتے ہیں اسی لیے بھیجتے ہیں کہ وہ نیک کردار لوگوں کے لیے خوشخبری دینے والے اور بدکرداروں کے لیے ڈرانے والے ہوں۔ تو جو لوگ ان کی بات مان لیں اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لیں اُن کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے، اور جو ہماری آیات کو جھٹلائیں وہ اپنی نافرمانیوں کی پاداش میں سزا بھگت کر رہیں گے۔

اے محمدؐ! ان سے کہو، "میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ نہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف اُس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر نازل کی جاتی ہے[2]۔" پھر ان سے پوچھو کیا اندھا اور آنکھوں والا دونوں برابر ہو سکتے ہیں[3]؟ کیا تم غور نہیں

(بقیہ سابق) وہ بات ہے جو اللہ کا وہ نیک بندہ بیس برس سے سمجھا رہا ہے اور ہم خواہ مخواہ اس سے لڑ رہے ہیں۔ یہ عکرمہ کی زندگی میں فیصلہ کن لمحہ تھا۔ انھوں نے اُسی وقت خدا سے عہد کیا کہ اگر میں اس طوفان سے بچ گیا تو سیدھا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤں گا اور ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے دوں گا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اس عہد کو پورا کیا اور بعد میں آ کر نہ صرف مسلمان ہوئے بلکہ اپنی بقیہ عمر اسلام کے لیے جہاد کرتے گذاری۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [1] یہاں دلوں پر مہر کر دینے سے مراد یہ ہے کہ سوچنے اور سمجھنے کی قوتیں سلب کر لی جائیں۔

[2] نادان لوگوں کے ذہن میں ہمیشہ سے یہ احمقانہ تصور رہا ہے کہ جو شخص خدا رسیدہ ہو وہ انسانیت سے

(باقی اگلے صفحہ پر)

ع ۵

کرتے۔

(بقیہ سابق) مادرا ہونا چاہیے، اس سے عجائب و غرائب صادر ہونے چاہییں، وہ ایک اشارہ کرے اور پہاڑ سونے کا بن جائے، وہ حکم دے اور زمین سے خزانے ابلنے لگیں، اس پر لوگوں کے اگلے پچھلے سب حالات روشن ہوں، وہ بتا دے کہ گم شدہ چیز کہاں رکھی ہے، مریض بچ جائے گا یا مر جائے گا، حاملہ کے پیٹ میں نر ہے یا مادہ۔ پھر اس کو انسانی کمزوریوں اور محدودیتوں سے بھی بالاتر ہونا چاہیے۔ بھلا وہ بھی کوئی خدا رسیدہ ہوا جسے بھوک اور پیاس لگے، جس کو نیند آئے، جس میں صنفی میلانات پائے جائیں، جو اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے خرید و فروخت کرتا پھرے، جسے کبھی قرض لینے کی ضرورت پیش آئے اور کبھی وہ مفلسی و تنگ دستی میں مبتلا ہو کر پریشان حال رہے۔ اسی قسم کے تصورات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصرین کی ذہنیت پر مسلط تھے۔ وہ جب آپ سے پیغمبری کا دعویٰ سنتے تھے تو آپ کی صداقت جانچنے کے لیے خوارق عادت کا مطالبہ کرتے تھے، اور آپ کو بالکل عام انسانوں جیسا ایک انسان دیکھ کر اعتراض کرتے تھے کہ یہ اچھا پیغمبر ہے جو کھاتا پیتا ہے، بیوی بچے رکھتا ہے، اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ انہی باتوں کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے۔

ستہ مطلب یہ ہے کہ میں جن حقیقتوں کو تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں ان کا میں نے مشاہدہ کیا ہے، وہ براہ راست میرے تجربہ میں آئی ہیں، مجھے وحی کے ذریعہ سے ان کا ٹھیک ٹھیک علم دیا گیا ہے، ان کے بارے میں میری شہادت آنکھوں دیکھی شہادت ہے۔ بخلاف اس کے تم ان حقیقتوں کی طرف سے اندھے ہو، تم ان کے بارے میں جو خیالات رکھتے ہو وہ یا تو قیاس و گمان پر مبنی ہیں یا محض اندھی تقلید پر۔ لہٰذا میرے اور تمہارے درمیان بینا اور نابینا کا سا فرق ہے اور اسی اعتبار سے مجھے تم پر فوقیت حاصل ہے، نہ اس اعتبار سے کہ میرے پاس خدائی کے خزانے ہیں یا میں عالم الغیب ہوں یا انسانی کمزوریوں سے مبرا ہوں۔

پارہ ۷ سورۃ الانعام ۶

مذہب کا انقلابی تصوّر

(از جناب مظہر الدین صاحب صدیقی۔ بی۔ اے)

بربادی اور کشت وخون کا وہ طوفان اور تخریب وہلاکت کا وہ شور وشر جس نے ساری دنیا کو تہ وبالا کر رکھا ہے درحقیقت ایک عالمگیر انقلاب کی آمد کا پیش خیمہ ہے۔ انسانیت ایک دور سے گزر کر دوسرے دور میں داخل ہوا چاہتی ہے اور جنگ کی آگ اور دھوئیں کے اندر سے ایک نئی دنیا نمودار ہونے والی ہے۔ اس نئی دنیا کی تعمیر اور اس کے نظامِ تمدن کی تشکیل کے لیے اس وقت جتنی زندہ اور کارفرما قوتیں باہم کشاکش میں مبتلا ہیں انھیں کی ترکیب سے انسانیت کا نیا ہیولیٰ تیار ہوگا۔ کوئی نئی قوت جو اس تصادم اور کشمکش میں ایک کارفرما عنصر کی حیثیت سے شریک نہیں ہے آنے والی انسانیت اور عالمِ نو کی تعمیر وتشکیل میں حصہ دار نہ ہو سکے گی۔

یہ وقت ہے کہ ہم مسلمان اپنی حالت کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ آیا ہمارے موجودہ مذہبی تصورات آنے والے طرزِ زندگی کو اپنے قالب میں ڈھال سکیں گے اور نئے افکار ونظریات کے مقابلہ میں اپنا موثر وجود باقی رکھ سکیں گے یا زندگی کی تازہ قوتیں ہمارے مذہب اور اخلاقی تصورات کی بنیادوں کو ہلا دیں گی اور ہمیں چار و ناچار اس نظامِ نو میں جذب ہو جانا پڑے گا جس کی تعمیر وتشکیل میں ہمارے اپنے عقائد ونظریات کو کوئی دخل نہ ہوگا۔

مسلمانوں میں مذہب کا جو تصور اس وقت رائج ہے اسے پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ دشوار معلوم ہوتا ہے کہ نظامِ نو کی تشکیل پر یہ تصور ایک زندہ قوت کی حیثیت سے اپنا اثر ڈال سکے گا۔ مذہب کے متعلق ہمارا موجودہ تصور یہ ہے کہ وہ انفرادی اعمال کی اصلاح اور شخصی نجات کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔ معاملاتِ تمدن سے اس کا تعلق اگر ہے تو بس اتنا کہ انسان اپنی ذات کے لیے کوئی ایسا عمل نہ کرے جس سے دوسروں کو نقصان پہنچے

کا احتمال ہو اور جہاں تک ممکن ہو برائی سے بچتا رہے۔ اگر بے تعصبی اور انصاف کے ساتھ ہمارے علما و مشائخ اور عوام پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ ہمارے جذبۂ مذہبی میں اس سے زیادہ آگے بڑھنے کی قوت مفقود ہے۔ مذہب سے جو کچھ محبت مسلمانوں میں باقی رہ گئی ہے وہ صرف حفاظت اور بقا کی خواہش تک محدود ہے۔ یعنی جو کچھ ہمیں اپنے بزرگوں سے ورثہ میں ملا ہے وہ جانے نہ پائے اور اسلام کے جو کچھ اثرات مسلمانوں کی زندگی پر باقی رہ گئے ہیں وہ زائل نہ ہو جائیں۔ دس کروڑ مسلمانوں میں سے دس ہزار مسلمان بھی نہیں ملیں گے جن کی ہمت پرواز تحفظ اور بقائے وجود سے بلند تر مقام حاصل کرنا چاہتی ہو۔

جس قوم کے افراد میں مذہب کا تصور یہ ہو اس کے متعلق یہ سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا کہ وہ اپنے مذہبی اور اخلاقی تصورات کی قوت سے آنے والے نظام کی تعمیر میں کیا حصہ لے گی۔ جو لوگ شب و روز اپنے ذاتی اغراض، خاندانی مفاد یا زیادہ سے زیادہ اپنی شخصی نجات کی فکر میں منہمک ہوں انھیں اس سے کیا بحث کہ دنیا کس نہج پر چل رہی ہے اور تمدنی نظام کس طرز پر تعمیر ہونے والا ہے۔ جس جماعت کے افراد عبادات (پوجا پاٹ) اور ریاضات سے نجات حاصل کر سکتے ہوں اسے میدان عمل میں آکر زندگی کی قوتوں سے نبرد آزما ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ جہاں گھر بیٹھے اوراد و وظائف، صوم و صلوٰۃ[1] اور تلاوت قرآن سے جنت حاصل ہو سکتی ہو وہاں اسلام کی مخالف قوتوں کا مقابلہ کرنے اور ان پر دینِ حق کو غالب کرنے کا جذبہ کیونکر پیدا ہو۔

---

[1] روزہ اور نماز کی فرضیت سے انکار قطعاً مقصود نہیں ہے۔ درحقیقت نماز ہی ہمارے جذبۂ دینی کی محافظ ہے۔ لیکن جب کسی عمل کا اصل محرک کمزور پڑ جاتا ہے اور وہ رسمی طور سے یا محض ضابطہ کی پابندی کے خیال سے کیا جانے لگتا ہے تو اس کے مطلوبہ اثرات مترتب نہیں ہوتے۔ آج ہماری نمازیں کیوں بے اثر ہیں؟ محض اس لیے کہ نماز کو مقصود بالذات خیال کیا جانے لگا ہے۔ مسلمان عام طور سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ نفس صوم و صلوٰۃ کی پابندی مذہبیت کی علامت ہے۔ حالانکہ مذہبیت ایک باطنی جذبہ ہے جس کا اظہار زندگی کے تمام اعمال سے ہوتا ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

جو لوگ شخصی نجات کے حصول کو مذہبی زندگی کی ابتدا اور انتہا تصور کرتے ہیں وہ درحقیقت ایک بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ شخصی نجات کو اجتماعی نجات سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ انفرادی زندگی میں کوئی شخص راست کرداری اور نیک عملی کی راہ میں استوار نہیں رہ سکتا جب تک اس کا اجتماعی ماحول ان صفات کے نشوونما کے لیے ساز گار نہ ہو۔ بڑے بڑے انسانوں اور مستثنیٰ شخصیتوں کو چھوڑ کر عام انسانوں کی ذہنیت اور سیرت بالکلیہ ان معاشرتی معیارات اور اخلاقی اقدار سے بنتی ہے جو ان کے خاندان اور سوسائیٹی میں رائج اور حکمراں ہوتے ہیں۔ جس معاشرہ میں غلط معیارات، باطل اقدار اور پست اخلاقی تصورات کی فرمانروائی ہو وہاں کوئی انسان محض اپنے شخصی اعمال کی بنا پر مشکل ہی سے نجات کا استحقاق پیدا کر سکتا ہے۔ ایسے معاشرہ میں فرد کی نجات کا دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ اپنے گرد وپیش کو بدلنے اور اپنی سوسائیٹی کے اخلاقی تصورات اور معاشرتی معیارات کو درست کرنے کے لیے کیا کر رہا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں پر مذہبًا یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ وہ جہاں کہیں برائی دیکھیں، اسے مٹانے کے لیے ممکن جدوجہد کریں۔ من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ وذٰلک اضعف الایمان (جو شخص تم میں سے کوئی برائی دیکھے اسے چاہیے

(بقیہ سابق) اب یہ جذبۂ باطنی تو باقی نہیں رہا ہے، صرف رسمی مظاہر رہ گئے ہیں۔ بقول علامہ اقبال مرحوم:

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے

مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے

صفیں کج دل پریشاں سجدہ بے ذوق

کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

کہ اپنے ہاتھ سے اس کی اصلاح۔ اگر اس کی قدرت نہ ہو تو زبان سے، اور اس کی بھی قدرت نہ ہو تو کم از کم دل میں اسے برا سمجھے اور یہ ضعیف ترین ایمان کا درجہ ہے) کیونکہ جو شخص کسی برائی پر صبر کر لیتا ہے اور اسے دور کرنے کی کوشش نہیں کرتا وہ درحقیقت اپنی شخصی نجات کے امکانات کو کم کر رہا ہے۔ مختصر یہ کہ اپنی نجات چاہتے ہو تو دنیا بھر کی نجات کے لیے فکر کرنی پڑے گی۔ اسی وجہ سے مسلمانوں کو صرف اپنے اعمال کی اصلاح کا حکم نہیں دیا گیا ہے بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر انھیں تمام انسانوں کی برائی اور بھلائی کا ذمہ دار ٹھیرایا گیا۔ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (تم دنیا کی بہترین امت ہو۔ نیکیوں کا حکم دیتے ہو اور لوگوں کو برائی سے روکتے ہو) اس حکم کی مصلحت یہ ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو دوسروں کی بھلائی اور برائی کا ذمہ دار سمجھے گا وہ لازماً اپنے اعمال کی اصلاح کے لیے بھی کوشاں رہے گا ورنہ سوسائٹی خود اسے ملامت کرے گی کہ دوسروں کو نصیحت کرنے سے پہلے اسے اپنے اعمال درست کر لینے چاہییں۔ نیز اس فرض کی انجام دہی میں اس کا ضمیر بھی اس سے احتساب کرتا رہے گا۔ لیکن دوسروں کو نیکی کی طرف دعوت دینا اور برائی سے روکنا اس وقت ممکن ہے جب دوسرے لوگ اس کی بتائی ہوئی نیکی کو نیکی خیال کریں اور جس بات کو وہ برا کہے اسے برا سمجھیں۔ بالفاظ دیگر اصلاح اعمال کی سعی و کوشش اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب خیر و شر کا وہ تصور اور حق و باطل کا وہ معیار عملاً کارفرما ہو جس کی طرف ہمیں دنیا کو دعوت دینی ہے۔ جہاں باطل نظامات نے غلبہ پا کر انسان کے معیار ترک و اختیار اور اقدار حیات کو الٹ کر رکھ دیا ہو وہاں نیکی کی طرف دعوت دینا اور برائی سے روکنا ایک فعل عبث ہے۔ کیونکہ جب تک نیکی اور بدی کا صحیح معیار پھر سے قائم نہ ہو جائے لوگ آپ کی دعوت کو جنون یا دقیانوسیت پر محمول کر کے حق سے اعراض کریں گے۔ النَّاسُ عَلَىٰ دِينِ مُلُوكِهِمْ (لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر چلتے ہیں) ایک تلخ حقیقت ہے جس سے آپ منہ نہیں موڑ سکتے۔ جو نظام تمدن دنیا پر غالب ہو گا اور جس قوم کی تہذیبی برتری عملاً قائم ہو گی اس کے اقدار و غایات دوسرے تمام انسانوں کے اقدار و غایات کا ماخذ ہوں گے اور اسی کا معیار

خیر و شر دنیا میں رائج ہوگا۔ صرف غیر مسلم ہی نہیں بلکہ مسلمان بھی شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر انھیں خیالات و نظریات کا دم بھریں گے جو حکمراں تہذیب اپنے ساتھ لائی ہے۔ پوری تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ دنیا میں حکمراں تہذیب کمزور اقوام کے مقاصد و افکار کو ڈھالا کرتی ہے۔ اس لیے اگر دوسروں کو اور اپنے آپ کو نیک بنانا ہے تو سب سے پہلے باطل نظامات کے پیدا کیے ہوئے نظریات و افکار کو توڑنا ہوگا اور اسلامی معیار خیر و شر کو دوبارہ قائم کرنا ہوگا۔ اسلامی تمدن اور اس کے نصب العین زندگی کے جو آثار ہماری سوسائٹی میں باقی رہ گئے ہیں ان کی حفاظت کا جذبہ ایک کمزور اور دفاعی جذبہ ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس نصب العین کی محبت ہم میں گھٹ کر کس قدر کم رہ گئی ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم اس نصب العین کو لے کر آگے بڑھیں اور اسے عملاً حاصل کرنے کی کوشش کریں، ہم چاہتے ہیں کہ جو کچھ بچے کھچے آثار قدیمہ رہ گئے ہیں وہ ضائع نہ ہونے پائیں۔ اس قسم کے منفی غایات (Negative Ends) کبھی فلاح و کامرانی کا ذریعہ نہیں بن سکتے۔ جو کچھ ہے اس کے باقی رکھنے کا خیال اصلاً غلط ہے۔ جس جماعت میں صرف بقار و حفاظت کا جذبہ کام کرتا ہے وہ ہمیشہ شکست و ناکامی کی ذلت سے دوچار ہوتی ہے۔ کچھ حاصل کرنے کی خواہش کیجیے تو جو کچھ ہے نہ صرف وہ باقی رہے گا بلکہ بہت کچھ اور حاصل ہو جائے گا۔ لیکن محض کسی شے کے باقی رکھنے کی کوشش ایک منفی عمل ہے جس کی ناکامی یقینی ہے۔ حفاظت اور بقار کا جذبہ حصولِ مقصد کی اقدامی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتا کیونکہ وہ ایک ایجابی عمل ہے۔ زوال پذیر قومیں چاہتی ہیں کہ ان کی سابقہ جد و جہد اور کوششوں کے نتائج محفوظ رہیں۔ تازہ دم اور زندہ اقوام اپنے ماضی کی عظمت یا گزشتہ جد و جہد کے ثمرات پر کبھی قناعت نہیں کرتیں بلکہ ایک بلندی پر پہنچتے ہی دوسری بلندی کی طرف بڑھنا شروع کر دیتی ہیں۔ ان کی ہر کامیابی ایک نئی جد و جہد کا پیام لاتی ہے۔ ان کی ہر فتحمندی سعی و طلب کے لیے تازیانہ بن جاتی ہے۔

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم ۔۔۔ از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

مسلمانوں کے مذہبی رہنماؤں کی یہ کوشش کہ جو کچھ اسلامیت ان میں رہ گئی ہے وہ کم نہ ہونے پائے اور اسلاف جو کچھ سرمایہ علم چھوڑ گئے ہیں وہ ضائع نہ ہو، ایک منفی مقصد ہے جس کی سرحدیں بے مقصدی سے جا ملتی ہیں۔

(۲)

قومی عروج و ترقی اور اجتماعی کامیابیوں کے اسباب کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ مقصد کا شعور اور اس کے حصول کی طلب و آرزو وہ اصلی قوت ہے جو اقوام و ملل کو کامیابی اور عظمت کی راہ پر لگاتی ہے۔ جماعت ہو یا فرد، مقاصد کی کشش اس کی جدوجہد کا اصلی محرک ہے۔ مقصد ہی حیات ہے۔ بے مقصدی موت ہے۔ انفرادی زندگی میں ہم روزانہ اس حقیقت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ کامیابی اور عزت انھیں افراد کے حصہ میں آتی ہے جو ابتدا سے کسی مقصد کا شعور رکھتے ہیں اور اس کے حصول میں زندگی کی دوسری دلچسپیوں کو قربان کرنے پر آمادہ رہتے ہیں۔ وہ شخص جو کوئی متعین مقصد نہیں رکھتا ہے یا جسے اپنے مقصد کا پورا پورا شعور نہیں ہوتا کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح وہ لوگ بھی ناکام رہتے ہیں جو مقصد تو رکھتے ہیں مگر اس سے اتنی وابستگی نہیں پیدا کر سکتے کہ ضرورت پڑنے پر دوسری دلچسپیوں سے منہ موڑ لیں۔ مقصد اور نصب العین ہی سے زندگی میں ترتیب و تنظیم پیدا ہوتی ہے اور انسانی قوتیں ایک مرکز پر جمع ہونے لگتی ہیں۔ جنگ سے پہلے جن لوگوں نے انگلستان، جرمنی اور روس کا سفر کیا تھا ان کا بیان ہے کہ انگلستان میں انھوں نے اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں میں کوئی ربط و نظم نہیں پایا۔ ہر فرد اور گروہ اپنے اپنے جداگانہ مقاصد کی تکمیل میں مصروف تھا اور مختلف طبقوں اور جماعتوں کی مساعی میں کوئی مشترک جذبہ کارفرما نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے برعکس روس اور جرمنی میں اجتماعی جدوجہد کا ایک مرکز تھا۔ سب کے سب ایک مشترک مقصد کے لیے کام کر رہے تھے۔ ہر شعبۂ زندگی کا دوسرے شعبہ سے گہرا ربط تھا۔ لیکن اگر اس وقت کوئی سیاح انگلستان جا کر وہاں کی اجتماعی زندگی کا مطالعہ کرے تو نقشہ بدلا ہوا نظر آئے گا۔

اب نہ انگلستان کی اجتماعی سرگرمیوں میں وہ آہستہ روی ہے، نہ افراد کے اغراض و مفاد کا کوئی سوال ہے، نہ مختلف جماعتوں میں باہم نزاع و اختلاف ہے۔ ہر کام سے تنظیم اور مقصدیت نمایاں ہے۔ اس انقلاب اور تبدیلی کا بجز اس کے اور کیا سبب ہو سکتا ہے کہ جنگ سے پہلے انگریز قوم کے سامنے کوئی معین نصب العین نہ تھا اور آب ایک واضح مقصد پیشِ نظر ہے جس کے حصول میں افرادِ قوم اپنے ذاتی خاندانی اور طبقاتی مفادات کو بھولے ہوئے ہیں۔ ایک اور مثال لیجیے۔ فرض کیجیے کہ آپ تاریخ کا مطالعہ محض اس غرض سے کرتے ہیں کہ اپنی حاصل کردہ معلومات کی وجہ سے آپ اپنے حلقۂ احباب میں عزت کی نظر سے دیکھے جائیں اور تاریخی مباحث پر گفتگو کرتے وقت معلومات کی کمی کے باعث دوسرے لوگ آپ کو نظرِ حقارت سے نہ دیکھیں۔ چونکہ آپ کا یہ مقصد ایک منفی مقصد ہے اس لیے آپ کی معلومات اپنی وسعت کے باوجود بے ربط رہیں گی۔ آپ کو تاریخی واقعات تو یاد ہو جائیں گے لیکن ان واقعات کی توجیہ کے لیے آپ کے سامنے کوئی معیار نہ ہوگا۔ بس آپ کے ذہن میں معلومات کا ایک منتشر اور بے جان ذخیرہ جمع ہو جائے گا۔ اب فرض کیجیے کہ آپ چند دنوں کے بعد اشتراکیت کے حامی ہو جائیں۔ معاً آپ کو تاریخی واقعات کی توجیہ کے لیے ایک کنجی ہاتھ آجائے گی۔ آپ کی معلومات میں داخلی ربط اور تسلسل پیدا ہو جائے گا۔ مختلف واقعات کی اضافی اہمیت کا ایک پیمانہ آپ کے پاس ہوگا اور آپ تاریخی واقعات کی قدر و قیمت ان کے معاشی نتائج کے اعتبار سے متعین کرنے لگیں گے۔ یا آپ ایک مسلمان کے نقطۂ نظر سے تاریخ پڑھنا شروع کریں جس کی نظر میں تاریخی واقعات اپنے اخلاقی نتائج کے اعتبار سے اہم ہوتے ہیں۔ آپ فوراً محسوس کریں گے کہ ایک معیارِ نقد و نظر آپ کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ آپ کی معلومات اپنی وسعت و کثرت کے باوجود ایک مرکز کے گرد مخصوص ترتیب کے ساتھ جمع ہو جائیں گی۔ یہ تبدیلی محض مقصد اور نصب العین کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ جب آپ تاریخ محض معلومات کی نمائش کے لیے پڑھتے ہیں تو آپ کا مقصد بے جان ہوتا ہے۔ اس لیے آپ کی معلومات میں بھی جان نہیں ہوتی۔ لیکن ایک مسلمان یا اشتراکی کی

حیثیت سے جب آپ تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو آپ کے پیشِ نظر ایک حقیقی اور ایجابی مقصد ہوتا ہے، اور یہی مقصد آپ کی معلومات میں روح پیدا کر دیتا ہے۔

غرض جہاں دیکھئے مقصد اور نصب العین ہی حیات بن کر افراد و اقوام کو سرگرمِ عمل کرتا ہے، ان میں زندگی کی حرارت اور سعی و طلب کا ولولہ پیدا کرتا ہے۔ اور مقصد ہی ان کے تمام اقدار و معیارات کا سرچشمہ اور ماخذ ہوتا ہے۔ تمدنی اور معاشرتی نظامات درحقیقت مقاصد و غایات کے ایک نظام پر قائم ہوتے ہیں۔ جس میں کوئی مقصد بجائے خود منتہائے نظر نہیں ہوتا۔ بلکہ اپنے سے برتر مقصد کا تابع اور اس سے ماخوذ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ پورا سلسلہ مقاصد ایک آخری غایت الغایات پر ختم ہوتا ہے۔ جو تمدنی زندگی کا منتہائے حقیقی اور مقصود اصلی ہوتا ہے۔ دوسرے تمام مقاصد غایت الغایات سے اپنی زندگی پاتے ہیں اور اگر کسی وقت اس نظام کے دوسرے مقاصد کا رشتہ آخری مقصد یا غایت الغایات سے ٹوٹ جاتا ہے تو سارے مقاصد بے جان ہو جاتے ہیں۔ اور تمدنی زندگی میں ضعف و انتشار کی علامات ظہور کرنے لگتی ہیں۔

مثال کے طور پر کسی قوم کی عسکریت اور فوجی طاقت کو لیجئے۔ ظاہر ہے کہ کوئی حکومت اور کوئی نظام فوجی طاقت کے بغیر اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتا لیکن عسکریت فی نفسہٖ مطلوب نہیں ہوا کرتی ہے۔ فوجی طاقت اس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب پوری قوم کسی برتر مقصد کیلئے کام کر رہی ہو اور عسکریت اس کیلئے بطور وسیلہ ضروری ہو۔ جب فوجی طاقت کے حصول پر توجہ کی جاتی ہے تو لازماً افراد قوم کی جسمانی صحت کو بہتر بنانے کی تدابیر بھی اختیار کی جاتی ہیں۔ اور جسمانی صحت کی ترقی ایک تبعی مقصد قرار پاتی ہے صحت عامہ کی اصلاح و ترقی کیلئے فن طب اور علم حفظانِ صحت پر توجہ مبذول کی جاتی ہے اور نتیجۃً علوم طب کی ترقی اور اشاعت بھی ایک ذیلی مقصد کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ اس طرح مقاصد کا ایک سلسلہ بن جاتا ہے۔ جو کسی آخری مقصد کے تابع ہوتا ہے۔ اب فرض کیجئے کہ ان تبعی مقاصد کو حقیقی مقصد قرار

دے دیا جائے اور افراد قوم اُس غایت الغایات کو بھول جائیں۔ جس کیلئے یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ کیا اِن مقاصد سے کوئی مقصد بھی زندہ رہ سکے گا؟ جہاں فوجی قوت یا صحت جسمانی فی نفسہٖ مقصود ہو وہاں تھوڑے ہی عرصہ میں یہ مقصد بھی کمزور پڑ جاتا ہے۔ کیونکہ حرکت و عمل کا جذبہ تو اس آخری مقصد کا آفریدہ تھا جس سے تبعی مقاصد برگ و بار کی طرح پیدا ہوتے تھے۔ جب مقصود اعلیٰ باقی نہ رہا جو اس پورے نظام مقاصد کا ماخذِ حیات تھا تو اس کی دوسری شاخیں کیوں نہ مُرجھا جائیں۔

یہی حال اسلام کے مذہبی نظام کا ہے۔ یہ پورا نظام اعلاءِ کلمۃ اللہ اور دین حق کے قیام کی سعی و طلب پر استوار ہے۔ روزہ اور نماز، حج اور زکواۃ، عبادات و فرائض اور اوامر و نواہی سب کے سب بالآخر اس غایت اصلی کے تابع ہیں کہ خدا کی زمین پر بس اُسی کی بندگی کی جائے اور معبودانِ باطل کو ہر جگہ سے نکال پھینکا جائے خواہ یہ معبود ہوائے نفس کی شکل اختیار کریں یا دیوتاؤں اور بتوں کی، طبقاتی اور قومی مفاد کی صورت میں ظاہر ہوں یا آمروں اور لیڈروں اور بادشاہوں کا بھیس بدل کر آئیں۔ جبکہ مسلمانوں میں اعلاءِ کلمۃ اللہ کی خدمت انجام دیکر اللہ کا تقرب حاصل کرنے کی طلب و آرزو تھی، جب تک اِن میں اسلام کے اخلاقی اقدار، اور قرآن کے معیار خیر و شر کو سارے عالم پر حکمران بناکر اپنے خدا کو راضی کرنے کی خواہش تھی۔ اس وقت تک اِن کی نمازوں میں روح تھی، عبادات میں جان تھی اور مذہبی نظام کے تمام اجزاء اس غایت اُخریٰ سے اپنی زندگی اور پرورش کا سامان حاصل کر رہے تھے۔ جب سے یہ غایت نظروں سے اوجھل ہوئی اسلامی زندگی کی ساری شاخیں مرجھا گئیں، نماز و روزہ اور شعائر مذہبی کو مقصود بالذات خیال کیا جانے لگا، قرآن کی تعلیم و تدریس اور علوم مذہبی کی تحصیل و اشاعت ایک خود مکتفی غایت بن گئی، اور اس طرح مذہبی نظام کے مختلف اجزاء کا باہمی ربط و اتصال عملاً ختم ہو گیا۔ کیونکہ جب کوئی عمل اپنا آپ مقصد بن جاتا ہے، تو پھر اس میں سے زندگی کی روح بھی سلب ہو جاتی ہے، ہر عمل کی زندگی اس کے مقصد سے وابستہ ہوتی ہے۔ جہاں یہ وابستگی کم ہوئی، عمل کی گرمجوشی اور روح بھی پژمردہ ہو جاتی ہے۔

آج مسلمانوں کی دینی اور دنیوی اصلاح کیلئے مختلف پروگرام مرتب کئے جا رہے ہیں۔ کہیں تنظیم کی پکار ہے، کہیں عسکریت اور فوجی طاقت کو قومی خرابیوں کا واحد علاج قرار دیا جا رہا ہے، کہیں ماہرین تعلیم مسلمانوں کے جہل کو دور کرنے کیلئے مدارس کے قیام اور جامعاتی تعلیم پر زور دے رہے ہیں، کہیں مذہبی تعلیم کا چرچا ہے اور درسِ قرآن کے ذریعہ مسلمانوں کو مذہب کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ ساری کوششیں تقریباً پچاس سال سے جاری ہیں، جب سے سرسید نے علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی اور انگریزی تعلیم کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ لیکن اس اصلاحی جدوجہد کو جیسی کامیابی چاہئے تھی نہیں ہوئی اس ناکامی کا واحد سبب یہ ہے کہ مسلمان بحیثیت مجموعی ابھی تک کسی حقیقی مقصد سے آشنا نہیں ہوئے ہیں۔ جب تک ان میں کسی اجتماعی تخیل سے محبت نہ پیدا ہو اور حصول مقصد کی طلب اُن کے جذبہ عمل کو بیدار نہ کر دے، یہ کوششیں اسی طرح ناکام رہیں گی۔ علم کی تحصیل ہو، عسکریت کا شوق ہو یا مذہب کا شغف، یہ سب بہر حال وسائل ہیں، مقاصد نہیں ہیں۔ اور مقصد کی غیر موجودگی میں وسائل کیا معنی رکھتے ہیں؟ وسائل تو حصولِ مقصد کی سعی و کوشش سے خود بخود پیدا ہوتے ہیں۔ جو شخص کوئی مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے وہ بہر حال اس کے حصول کیلئے ضروری وسائل اختیار کرے گا۔ یہاں سارا زور وسائل پر دیا جا رہا ہے، اور مقصد سرے سے غائب ہے۔ یہ طریقِ کار اصولاً غلط ہے۔ قوموں میں پہلے مقصد کا شعور اور اس سے عشق پیدا ہوتا ہے، پھر اس کی طلب اور اس کے حصول کی کوشش میں ضروری وسائل اور تدابیر خود بخود اختیار کرنی پڑتی ہیں۔ عقلی ترقی بھی مقصد اور نصب العین کی محبت ہی سے ظہور میں آتی ہے، کیونکہ انسان اپنی عقلی قوتوں اور صلاحیتوں سے پورے جوش و خروش کے ساتھ اسی وقت کام لیتا ہے۔ جب اسے اپنا مقصد حاصل کرنے میں دشواریاں پیش آ رہی ہوں۔ محبت کا جنون اور عقل کی ترقی دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جنون سے ہی عقل صحیح پیدا ہوتی ہے۔

"زمانہ ایسچ نداند حقیقت اور ا! جنوں قباست کہ موزوں بقامت خرد است"

انسان کی عقلی قوتیں اس کی خدمت گار ہیں، آقا نہیں ہیں۔ عقل کی حیثیت بالکل ایک آلہ کی سی ہے جس سے ہم اپنی خواہش کے مطابق کام لے سکتے ہیں۔ مقاصد و غایات عقل سے نہیں پیدا ہوتے۔ اس لئے یہ کوشش بھی غلط ہے کہ مسلمانوں کو علوم عقلیہ کی طرف متوجہ کرا کے اُن کی ترقی کا سامان پیدا کیا جائے ترقی جدوجہد سے پیدا ہوتی ہے اور جدوجہد کیلئے نصب العین کا ہونا ضروری ہے۔ آج اگر مسلمان کسی اجتماعی تخیل یا نصب العین سے محبت کرنے لگیں، پھر دیکھئے کہ اس کے حصول کی جدوجہد اور کوشش میں کس طرح اُن کی عقلی قوتیں اُبھرنے لگتی ہیں۔ تعلیم کی اشاعت، عسکریت کی تبلیغ اور علوم دینی اور دنیوی کی تحصیل، یہ سب کام نہایت جوش اور سرگرمی کے ساتھ خود بخود حصولِ مقصد کی کوشش میں حسن و خوبی سے انجام پذیر ہو جائیں گے۔

عہد رسالت کے مسلمانوں کو آج کل کے مسلمانوں سے یہی چیز ممیز کرتی ہے کہ ان میں مقصد کی لگن اور نصب العین کا عشق تھا۔ وہ ایک عالمگیر تخیل کے داعی تھے اور اس تخیل سے ان میں ایسی شدید محبت تھی کہ اس کے لئے کوئی قربانی نہ تھی جسے انہوں نے گوارا نہ کیا ہو اور کوئی مشقت نہ تھی جو انہوں نے سہی نہ ہو۔ اسی مقصد کی خاطر انہوں نے علم کی روشنی حاصل کی، جاہلیت کے رسوم و عقائد کو یکلخت ترک کر دیا اور چند سال کے عرصہ میں وہ ساری صفات حاصل کر لیں جو دنیا کی ترقی پذیر اور بڑھنے والی قوموں میں نمایاں ہوتی ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے جہالت کو دور کرنے کی کوشش میں اشاعت تعلیم کی غرض سے مکتب اور مدرسے نہیں کھولے، عربوں کی سماجی اور معاشی اصلاح کی طرف توجہ نہیں کی، بلکہ سب سے پہلے اُنہیں ایک تخیل عطا کیا، ایک نصب العین اور مقصد سے آشنا کیا، اور جب اس تخیل کا عشق اور اس مقصد کی محبت اُن کے دلوں میں راسخ ہو گئی تو پھر اُن کے لئے شریعت کے اوامر و نواہی پر عمل کرنا اور فرائض کو بجا لانا کوئی دشوار کام نہیں رہا۔ عشق کا جنون وہ ہے کہ جب سر پر سوار ہوتا ہے تو محبوب کی طلب میں کوئی مزاحمت مزاحمت نہیں معلوم ہوتی، کوئی مصیبت

مصیبت نہیں رہتی، اور شوقِ منزل انسان کو راہ کی تمام دشواریوں سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

"وہ پائے شوق دے جو جہت آشنا نہ ہو پوچھوں نہ خضر سے بھی کہ جاؤں کدھر کو میں"

عشق کی آگ ساری مصیبتوں۔ کلفتوں اور تمام آلامِ حیات کو جلا کر خاک کر دیتی ہے۔

"آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا! جو غم ہوا اُسے غمِ جاناں بنا دیا"

ہمارا مذہب اس لئے بے جان ہے کہ تخیل کی عظمت اور مقصد کے عشق سے اس کا تعلق ٹوٹ چکا ہے اس لئے نماز روزہ اور فرائض دین کی پابندی ہمارے لئے لذت و حلاوت سے خالی ہے۔

(۳)

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے اسلام اور ہمارے اسلام میں بنیادی فرق و اختلاف ہے۔ ہمارا مذہب وہ مذہب نہیں ہے، جیسے عہدِ رسالت کے مسلمانوں نے قبول کیا تھا، اور جس پر انہوں نے اپنی زندگی کی بنیادیں استوار کی تھیں۔ وہ ایک جاندار، انقلاب انگیز اور متحرک نظامِ فکر و عمل تھا۔ جس کا خمیر عشق کی ولولہ انگیزیوں اور جنون نوازیوں سے تیار ہوا تھا، جس میں ایثار و قربانی اور سرفروشیوں کی ایک دُنیا آباد تھی، اور جس میں محض افراد کی شخصی نجات کا نہیں۔ بلکہ عالم انسانیت کی نجات کا تصور اور جذبہ کارفرما تھا صحابہ کرام ایک نظامِ تمدن اور طرزِ زندگی کے داعی تھے، ایک عالمگیر نصب العین کے نمائندے تھے۔ اور ایک جہانی اور عالمگیر مقصد کے علمبردار تھے، چنانچہ اُن کے اعمال و عبادات کی قدر و قیمت اسی نسبت سے متعین کی جاتی تھی جس نسبت سے وہ اس نصب العین اور غایتِ اولیٰ کی تقویت کا باعث ہوتے تھے۔ جہاد فی سبیل اللہ اُن کے اخلاص و انقیاد کا پیمانہ تھا، اور خدا کے ہاں ان کا اجر بھی اسی پیمانہ سے تقسیم ہوتا تھا۔

وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِينَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِينَ دَرَجَةً وَكُلًّا وَعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى

(اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو گھر بیٹھنے والوں پر بڑی فضیلت دی ہے اگرچہ ہر ایک سے اچھائی کا وعدہ کیا ہے)۔

اسلامی نصب العین کی ترقی اور اسلامی نظامِ تمدن اور طرزِ تفکر کی تبلیغ اُن کی زندگی کا اتنا بڑا سرمایہ تھا

کہ اگر کبھی ان سے اس کام میں کوتاہی ہو جاتی تو ساری عبادتیں اور ریاضتیں ان کی نگاہ میں اکارت ہو جاتی تھیں۔ چنانچہ جہاد ہی کے سلسلہ میں کلام مجید ارشاد فرماتا ہے۔" قل ان کان آباؤکم وابناؤکم واخوانکم وازواجکم وعشیرتکم واموال ن اقترفتموھا وتجارۃ تخشون کسادھا ومساکن ترضونھا احب علیکم من اللہ ورسولہ وجہاد فی سبیلہ فتربصو حتی یاتی اللہ بامرہ۔" (اے رسول، کہدو کہ اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارے اہل خاندان اور وہ مال جنہیں تم نے جمع کیا ہے اور وہ تجارت جس کے نقصان سے تم ڈرتے ہو؛ اور وہ قیام گاہیں جو تمہیں پسند ہیں، اگر یہ سب چیزیں اللہ اور رسول سے اور اللہ کی راہ میں جد و جہد کرنے سے تم کو عزیز تر ہیں تو انتظار کرو۔ یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم تمہارے سامنے لے آئے"

غور کیجئے یہ مخاطبت کن لوگوں سے کی جارہی ہے؟ اُن سے جن کی نمازیں اور عبادتیں یکسر خلوص وللہیت سے معمور تھیں۔ جن کے اعمال صالحہ اور فضائل اخلاق دنیا کی ساری تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ جن کے درجات اور علوئے مرتبت پر خود قرآن گواہی دے رہا ہے۔ اس کے باوجود انہیں چیلنج دیا جارہا ہے۔ کہ اگر زندگی کی محبتوں اور الفتوں نے دین حق کی اقامت اور اعلا کلمتہ اللہ کی راہ میں ادنےٰ اسی رکاوٹ بھی پیدا کی تو پھر خدا کے حکم کے منتظر رہو۔

[آج جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہماری نمازیں اور دعائیں، ہمارے اوراد و وظائف، اور ہماری پرستشیں اور ریاضتیں، آخروی نجات و فلاح کیلئے کافی ہیں انہیں غور کرنا چاہیئے کہ جب صحابہ کرام کو ان کی نمازوں اور عبادتوں اور اعمال صالحہ کے باوجود انجام سے اس لئے ڈرایا جارہا ہے کہ مبادا اسلام کی سربلندی اور دین حق کے غلبہ کی کوشش میں ان کے قدم سست پڑ جائیں، تو ہم لوگوں کی عبادتیں کس شمار و قطار میں ہیں جبکہ ہم خدا کے دین کو سربلند کرنے اور اسلام کو دنیا پر غالب کرنے کیلئے ادنےٰ ترین قربانی دینے پر بھی تیار نہیں ہیں، یہاں تک کہ ہمارے قلوب بھی اب اس آرزو اور تمنّا سے خالی ہو

چکے ہیں کہ خدا کی زمین پر اس کا کلمہ بلند ہو اور اس کے عطا کئے ہوئے قانونِ سعادت، اور ضابطۂ حیات کا بول بالا ہو۔ کیا آج اسلامی نظام عملاً اسی طرح کفر کے غلبہ سے گھرا ہوا نہیں ہے جس طرح وہ مدنی زندگی میں کفر کی طاقتوں سے محصور تھا ؟ اور کیا آج دینِ حق کے قیام اور اسلامی طرزِ زندگی کو ایک عملی حقیقت بنانے میں جانفروشی اور ایثار و قربانی کی کچھ کم ضرورت ہے ؟ غزوۂ تبوک کے موقع پر حضرت کعب بن مالک مرارہ بن ربیع اور ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہم اپنی عبادات اور اعمالِ صالحہ کے باوجود خدا اور رسولؐ کی بارگاہ میں کیوں معتوب ہوئے تھے ؟ محض اس لئے کہ وہ اسلام و کفر کی کشمکش میں اسلام کا ساتھ دینے سے باز رہے تھے۔ اس غفلت پر انہیں ایسی سخت سزا دی گئی کہ دورانِ سزا ہیں زندگی اُن کیلئے وبال ہوگئی۔ اور خدا کی زمین انہیں تنگ نظر آنے لگی۔ یہ واقعہ صاف طور پر ظاہر کرتا ہے کہ دینِ حق کے قیام اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کے مقابلہ میں انسان کے کسی عمل کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ اور اگر اس فرض میں انسان سے کوتاہی ہو جائے تو پھر نہ نمازیں اس کے کام آسکتی ہیں اور نہ عبادات سے نجات مل سکتی ہے اس کا سبب بھی ظاہر ہے۔ نماز روزہ اور عبادات اور اعمالِ صالحہ سب درحقیقت اس لئے ہیں کہ کائنات عالم میں صرف خدائے واحد کی بندگی ہو، اسی کا قانون بالاتر ہو اور اسی کی مرضی حکمران ہو اگر دنیا معبودانِ باطل کی بندگی میں لگی ہو۔ غیر الٰہی نظامات غالب ہوں اور اسلامی اقدار آپ کی آنکھوں کے سامنے مٹ رہی ہوں، لیکن آپ مسجدوں میں نمازیں پڑھتے رہیں یا لمبی لمبی تسبیحیں لیکر شب بیداری اور تہجد گذاری کرتے رہیں تو حقیقتاً آپ کو نہ اسلام سے محبت ہے اور نہ کفر سے نفرت۔ اس لئے کلامِ مجید نے صاف کہہ دیا ہے کہ بڑی سے بڑی نیکی ایمان باللہ اور جہاد فی سبیل اللہ کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتی ہے۔ اجعلتم سقایۃ الحاج وعمارۃ المسجد الحرام کمن امن باللّٰہ و الیوم الاخر وجاھد فی سبیلہ (کیا تم نے حاجیوں کے پانی پلانے اور مسجد حرام کی تعمیر کو اللہ پر ایمان لانے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے کے برابر سمجھ رکھا ہے ؟) اس آیت میں ایک لطیف اشارہ اس حقیقت کی طرف کیا

گیا ہے کہ ایمان باللہ کی حقیقی کسوٹی جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ ایمان خالص کا معیار ہی یہ ہے کہ انسان معبودانِ باطل کے مقابلہ میں خدا کا بول بالا کرنے کیلئے بیتاب ہو اور اس کی راہ میں جان لڑانے پر آمادہ ہو جائے۔ دُنیا کی اور نیکیوں میں ذاتی منفعت کی توقع اور خواہشات نفس کی آمیزش ہو سکتی ہے، لیکن خدا کی راہ میں جان نثاری صرف محبت کے جذبہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ماں باپ کی خبرگیری میں رضائے الٰہی سے زیادہ والدین کی محبت کا جذبہ بھی کارفرما ہو سکتا ہے، غریب رشتہ داروں اور فقراء و مساکین کی امداد بنی نوع انسان کی عام ہمدردی پر بھی مبنی ہو سکتی ہے، لیکن خدا کے دین کیلئے سر دینا صرف رضائے الٰہی کی طلب کا نتیجہ ہو سکتا ہے جس میں کسی اور جذبہ کی آمیزش ممکن نہیں ہے۔

ایمان باللہ کا حقیقی امتحان صرف جہاد میں ہوتا ہے اور یہی وہ کسوٹی ہے جس پر کھرے کھوٹے کی تمیز ہو جاتی ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو اپنی نیکیوں پر قانع ہو کر نہیں بیٹھنا چاہئے کیونکہ ممکن ہے ہماری نیکیاں خالص اور بے آمیز نہ ہوں بلکہ ان میں ذاتی یا قومی مفاد کی خواہش بھی شامل ہو۔ اپنے ایمان کا امتحان کرنا چاہئے ہو تو دیکھو کہ خدا کی راہ میں تکالیف و مصائب برداشت کرنے کی خواہش تم میں کتنی ہے۔ کیونکہ یہی خواہش ایمان کی حقیقی کسوٹی ہے چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "من مات ولم یغز ولم یحدث به نفسه مات علی شعبۃ من النفاق" (جس شخص کو اس طرح موت آئے کہ نہ تو اس نے خدا کی راہ میں جہاد کیا اور نہ اپنے دل میں جہاد کی خواہش کی تو وہ ایک طرح سے نفاق کی حالت میں مرا)۔ غور کیجئے آج کتنے مسلمان ہیں جن کے قلوب جہاد فی سبیل اللہ کی خواہش سے معمور ہیں؟ جو لوگ ہم میں سے دیندار ہیں انہیں کے دلوں کا جائزہ لیجئے۔ کیا ان میں سرفروشی اور جان نثاری کی آرزو کہیں جھلکتی نظر آتی ہے؟ جہاد فی سبیل اللہ کی خواہش تو اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب ہم موجودہ غیر اسلامی ماحول اور کافرانہ نظام تمدن سے غیر مطمئن ہوں اور اسے بدلنے کی آرزو رکھتے ہوں۔ وہ لوگ جہاد کی تمنا کیوں کرنے لگے جو موجودہ ماحول کی آسائشوں اور نعمتوں اور غیر اسلامی نظامات کے منافع سے استفادہ کر رہے ہوں۔ اور نہ تو اس استفادہ

کو بُرا سمجھتے ہوں۔ اور نہ ان نظامات سے باہر نکلنا چاہتے ہوں۔ جو لوگ غیر اسلامی نظامات اور باطل افکار و اقدار کی خدمت کرنے اور ان سے نفع حاصل کرنے کے بعد محض روزہ نماز اور تسبیح و تہلیل کی بناء پر اپنے تئیں نجات کا مستحق سمجھتے ہوں انہیں کیا پڑی ہے کہ حق کے قیام کی خاطر جان و مال کی قربانی دیں اور صداقت کی تبلیغ و اشاعت کیلئے تکلیفیں اور مصیبتیں برداشت کریں۔ خدا کا کلمہ بلند کرنے کی خواہش اور اس کیلئے ایثار و جانفروشی کا جذبہ تو اس جماعت میں پیدا ہو سکتا ہے۔ جو کافرانہ تہذیب سے بیزار اور اس کی جگہ اسلامی تہذیب کے قیام کی آرزو مند ہو۔ اس کے برخلاف غیر اسلامی نظامات سے ہماری وابستگی اس قدر پختہ ہو گئی ہے کہ نہ صرف ہم میں ان نظامات سے باہر نکلنے کی خواہش باقی نہیں رہی ہے بلکہ جب کبھی ان کو خطرہ لاحق ہوتا ہے، ہماری تمام کوششیں ان نظامات کی حفاظت و بقا میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ ہم میں سے جو لوگ فی الجملہ مذہب کے پابند ہیں انہوں نے بھی عبادات و ریاضات اور معاشرتی فرائض کی ادائیگی کو پورا مذہب سمجھ رکھا ہے۔ غیر اسلامی تہذیب و تمدن کی جگہ اسلامی تہذیب کے قیام کی نہ ان میں آرزو باقی رہ گئی ہے اور نہ اس کے لئے وہ کسی قسم کی جد و جہد کرنے پر آمادہ ہیں۔ اگر مذکورہ بالا حدیث کی روشنی میں ہم اپنے قلوب کا جائزہ لیں تو معلوم ہو گا کہ ہم میں سے ننانوے فیصد بلکہ اس سے زیادہ اشخاص نفاق کے زنگ سے آلودہ ہیں۔ کیونکہ ہم میں غیر اسلامی تہذیب و نظامات سے نکلنے کی خواہش عملاً مفقود ہے۔ اور درحقیقت یہی ہماری بے بسی، ذلت اور تمام قومی اور دینی مصائب کی اصلی علت ہے کہ اسلامی اقدار و غایات کی طلب اور اسلامی نظام کے قیام کی جد و جہد سے ہم بالکل غافل ہیں جب تک مسلمانوں میں یہ جذبہ نہ پیدا ہو گا اور جہاد فی سبیل اللہ کی آرزو اور خواہش ان کے دلوں کو بیتاب نہ کر دے گی۔ یہ ساری سیاست بازی اور نمائشی تنظیم کچھ کام نہ آسکے گی اور ذلت و رسوائی کا داغ ہماری قومی پیشانی پر اسی طرح لگا رہے گا خواہ ہم میں سے ہر شخص پانچ وقت کی بجائے سو وقت کی نمازیں پڑھنے لگے اور ہمارا ہر نوجوان علوم دینی میں کامل و ماہر بن کر آسمان شہرت پر چمکنے لگے۔

حضور رسالتماب کا ارشاد اس بارے میں بالکل صاف اور غیر مبہم ہے۔ آپ نے فرمایا: "مَا تَرَكَ قَوْمٌ الْجِهَادَ إِلَّا عَمَّهُمُ اللهُ تَعَالَىٰ بِالْعَذَابِ" (جو قوم جہاد ترک کرتی ہے اللہ تعالیٰ اس پر اپنا عذاب عام کر دیتا ہے)۔ جب سے مسلمانوں نے مجاہدانہ زندگی ترک کی ان پر غلامی اور کفار کے تسلط کا عذاب نازل ہوا۔ مجاہدانہ زندگی مسلمان کی سب سے بڑی عزت اور فضیلت ہے۔ چونکہ ہم مذہب کے معمولی فرائض و واجبات پر قانع ہو گئے ہیں اور فضیلت کے اعلیٰ مقام تک پہنچنے کی آرزو سے ہمارے قلوب خالی ہو چکے ہیں۔ اسی لئے ہم پر پستی اور دوں ہمتی طاری ہے۔ نیکی یہ بھی ہے کہ وہ خدا کی راہ میں صعوبتیں برداشت کرے اور اللہ کا کلمہ بلند کرنے کیلئے ایثار و جانفروشی کرے۔ لیکن ان دونوں نیکیوں میں ایک عظیم الشان فرق ہے۔ جو لوگ صرف ادنیٰ نیکیوں پر قناعت کر لیتے ہیں انہیں دنیا میں ترقی اور سربلندی کی خواہش سے بھی دست بردار ہو جانا پڑتا ہے۔ رفعت و سربلندی صرف ان قوموں اور جماعتوں کا حصہ ہے جو اعلیٰ ترین نیکیوں اور بلند ترین درجات کیلئے کوشاں رہتی ہیں۔ انسان کی کامیابیاں اور مسرتیں اس کے تخیل کی رفعت کے اعتبار سے کم یا زیادہ ہوتی ہیں۔ اگر تخیل بلند ہے تو کامیابیاں اور مسرتیں بھی بلند ہوں گی۔ ہم نے مذہب کا پست تصور اختیار کیا ہے اس لئے ہماری کامیابیوں کا دائرہ محدود اور مسرتوں کی سطح بھی پست ہے۔

(۴)

اسلامی نظام تمدن کے قیام اور دین حق کے غلبہ کا نام سن کر مسلمانوں کا ایک گروہ ادبیاء اور صوفیاء کرام کی زندگیوں کو بطور نمونہ پیش کرتا ہے۔ اس گروہ کا استدلال یہ ہے کہ حضرات صوفیا نے جو اعمال صالحہ اور تزکیہ نفس کے اعتبار سے ہم سے بدرجہا بلند تھے اسلام کو ایک نظام تمدن کی حیثیت سے نہیں پیش کیا اور نہ اپنے زمانہ کے سیاسی اور معاشی نظام کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی بلکہ اعمال صالحہ کی تلقین اور تزکیہ نفوس کے کام کو اپنے لئے کافی خیال کیا۔ جب اس بلند پایہ جماعت نے جو شریعت کے اسرار و رموز کی حامل تھی اپنے وقت کے تمدنی نظام کو ہاتھ نہیں لگایا تو ہم لوگ کیسے جسارت کر سکتے ہیں کہ اپنے تمام عیوب و نقائص

کے ساتھ اسلامی نظام کو بلند و برتر کرنے کا عزم لیکر اٹھیں۔ یہ کام صرف اسی جماعت سے ہو سکتا ہے جو اعمال و اخلاق کے بلند ترین مرتبہ پر فائز ہو۔

اس طرز استدلال میں کئی ایک خامیاں ہیں جن پر اکثر لوگ غور نہیں کرتے۔

اولاً حضرات صوفیاء اور اولیاء کرام نے اصلاح اعمال اور تزکیہ نفس کا جو گرانقدر کام انجام دیا وہ ہم سب لوگوں کیلئے نمونہ ہے لیکن جو کچھ انہوں نے نہیں کیا اُسے ہم اپنے لئے سند نہیں بنا سکتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک کو مستثنےٰ کر کے کسی فرد یا افراد کی غیر مشروط پیروی مسلمانوں پر واجب نہیں ہے۔ خواہ ان کا رتبہ خدا کے ہاں کیسا ہی بلند ہو۔ اطاعت مطلق اور اتباع کامل صرف حضور رسالتمآب کی ذات پاک کیلئے مخصوص ہے۔ اس لئے کسی انسان یا انسانوں کی کسی جماعت کو اس طرح نمونہ بنا کر پیش کرنا کہ گویا جو کچھ اُس نے کیا اور جو کچھ نہیں کیا سب ہمارے لئے سند ہے یا اس کا ہر فعل ہمارے لئے قابل تقلید ہے اور ہر قول ہمارے لئے واجب التعمیل ہے، یہ اتنی بڑی گمراہی اور ضلالت ہے کہ اس سے ہر مسلمان کو پناہ مانگنی چاہئے۔ صوفیاء کرام کی تقلید و اتباع ایمان و اسلام کے شرائط میں سے نہیں ہے۔ جو لوگ بزرگوں کا احترام اور اولیاء و صوفیاء کی محبت میں یہاں تک متجاوز ہو چکے ہیں۔ ان سے کسی قسم کی بحث یا استدلال بیکار ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن میں اشخاص کی محبت اسلام کی محبت پر اس طرح غالب آگئی ہے کہ اگر اسلام کو اُن کی اس محبت سے نقصان پہنچ رہا ہو تو بھی وہ اس سے دست کشی پر آمادہ نہ ہونگے۔ ایسے لوگوں سے ہم صرف اتنا عرض کریں گے کہ اولیائے کرام اور حضرات صوفیاء کی بلندی مرتبت اور ان کے درجات عالیہ کو پوری طرح نظر میں رکھتے ہوئے اور ان کا پورا پورا احترام کرتے ہوئے بھی ایک مسلمان صرف حضور رسالت مآب کی زندگی اور حضور کی حیات طیبہ کو اپنے لئے مشعل ہدایت بنا سکتا ہے۔ اور اسی میں اپنے لئے راہ سعادت تلاش کر سکتا ہے۔ اور حضور کے بعد اگر کوئی جماعت ہمارے لئے سب سے زیادہ عزت و توقیر کی مستحق اور اتباع و تقلید کی لائق ہے تو وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت ہے

جنہوں نے جہاد فی سبیل اللہ بھی کیا، غیر اسلامی نظامات کو دُنیا سے مٹانے کیلئے اپنی جانیں بھی قربان کیں، تدبیر مملکت اور انتظام حکومت کا بار بھی اُٹھایا اور ان "دنیوی" کاموں کو کبھی "دینداری" سے الگ خیال نہیں کیا۔ حضرات صوفیا اور اولیائے کرام نے تزکیہ نفوس اور اصلاحِ اعمال کے سلسلہ میں جو خدمات انجام دی ہیں، اُن کی تنقیص کرنا یا اُن کے اثرات و نتائج سے انکار کرنا کسی مسلمان کے شایانِ شان نہیں ہے۔ لیکن اس ضمن میں بحث کا جو پہلو نظروں سے اوجھل رہ گیا ہے وہ یہ ہے کہ اصلاحِ اعمال اور تزکیہ نفوس کا کام اسی سوسائٹی میں بارآور ہو سکتا ہے۔ جس کے افراد اسلامی نصب العین کی صداقت پر ایمان رکھتے ہوں۔ اور فی الجملہ اسلامی نقطۂ نظر اور طرزِ فکر کے حامل ہوں۔ لیکن جب نظامِ تمدن میں انسان اخلاقی اقدار و غایات کا منکر ہو گیا ہو، جہاں مادی نقطۂ نظر انسان پر اس طرح چھا گیا ہو کہ وہ روحانی مقاصد اور باطنی اصلاح کو لایعنی قرار دینے لگے، جس ماحول میں اسلامی فکر و نظر اور اسلامی نصب العین زندگی عملاً معدوم ہو۔ وہاں اصلاحِ اعمال اور تزکیہ نفوس کا کام کیونکر کامیاب ہو سکتا ہے۔ آج مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد بالخصوص مغرب زدہ جماعت نیکی اور بدی کے اسلامی تصورات سے برگشتہ اور سراسر کافرانہ تصورات میں غرق ہے۔ مذہب و اخلاق کے متعلق بھی اُن کا تصور اور انداز فکر وہی ہے جسے انہوں نے مغرب سے ورثہ میں پایا ہے۔ جب ہماری سوسائٹی میں اسلامی افکار اور تصورات کی گرفت اتنی ڈھیلی ہو گئی ہے اور باطل تخیلات کا غلبہ اس قدر سخت ہوتا جا رہا ہے تو اصلاح اعمال کی کوشش کیسے کارگر ہو سکتی ہے جہاں سرے سے ایمان ہی غائب ہو۔ وہاں عمل صالح کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اہل تصوف کی خانقاہیں بمردہ ہیں اور ان نفوسِ قدسیہ کے وجود سے دنیا خالی نظر آتی ہے۔ جن کی ایک نگاہ انسانوں کو قلب ماہیت کر دیتی تھیں، اور حقیقت تو یہ ہے کہ مروجہ تمدنی اور معاشرتی ماحول میں اس قسم کا افراد نشوونما [illegible]

یہ سوال کہ اصحابِ تصوف اور اولیائے اکرام نے اپنے زمانہ کے سیاسی اور تمدنی نظام کو کیوں ہاتھ میں نہیں لیا، بالکل بے معنی ہے۔ وہ تمدنی نظام جس میں اُن کی نشوونما ہوئی تھی اصلاً اسلامی

نظام تمدن تھا۔ حکومت کا طرز اور سیاست کا نظام ضرور بدل گیا تھا لیکن معاشرت و تمدن کا پورا ڈھانچہ اسلامی طرز پر بدستور قائم تھا۔ غیر اسلامی اثرات کی آمیزش سے وہ دور بھی پاک نہ تھا لیکن یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ تمدنی اور معاشرتی نظام میں اسلامی عنصر غیر اسلامی عناصر پر غالب تھا۔ اخلاقی تصورات، روحانی اقدار اور معاشرتی معیارات میں بگاڑ پیدا ہو چکا تھا مگر اس طرح نہیں کہ ان کا اسلامی رنگ بالکل اڑ گیا ہو اسلام کی حقیقی روح اپنی پوری تازگی اور قوت کے ساتھ نہیں تو کم از کم ایک کمزور اور معمولی شکل میں اس دور کے افکار و اعمال میں جاری و ساری تھی۔ سلاطین اور امرا اسلام سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ لیکن عام مسلمان ان کی برائیوں اور گمراہیوں سے محفوظ تھے۔ ایسے دور میں اگر ارباب تصوف اور اہل باطن نے تزکیہ نفوس اور اصلاح اعمال کی کوشش پر اکتفا کیا تو ایسا کرنے میں وہ کسی حد تک حق بجانب تھے انہوں نے نظامِ سیاست اور طرزِ حکومت و تمدن کو بدلنے کی ضرورت محسوس نہ کی کیونکہ حکومت کا مذہب اسلام تھا، ملکی قوانین قانونِ شریعت کے تابع تھے اور امراء و سلاطین اپنی ساری بدعنوانیوں اور فسق و فجور کے باوجود اسلام سے اتنی محبت ضرور رکھتے تھے۔ کہ غیر اسلامی تصورات و افکار کی دانستہ اشاعت انہیں گوارا نہ تھی۔ اور نہ وہ باطل خیالات و افکار کے ساتھ رواداری برتنے پر آمادہ تھے۔ بلکہ بہت سے سلاطین و امراء شخصی حیثیت سے بھی دیندار اور متقی تھے۔ خود ہندوستان میں سلطان شمس الدین التمش، بلبن، محمد تغلق، عالمگیر اور بعض دیگر امراء و سلاطین اپنے اتقاء اور شغفِ مذہبی کے اعتبار سے بہت بلند پایہ مسلمان تھے۔ لیکن آج حالات کیا وہی ہیں؟ کیا وہ نظام حکومت اور وہ ملکی قانون، جس کے تحت ہم زندگی بسر کر رہے ہیں، شریعت سے کوئی دور کی نسبت بھی رکھتا ہے؟ موجودہ زمانہ کے امراء اور اصحابِ اثر کو چھوڑیئے، کیا آج عام مسلمانوں پر بھی اسلامی عقائد و افکار کی گرفت ویسی ہی ہے، جیسی کہ بارہویں اور تیرہویں صدی میں ہندوستان کے امراء اور سلاطین پر تھی؟ جب عوام کی یہ حالت ہو تو امراء اور اصحاب دولت کی کیفیت معلوم۔ کیا ہمارے آج کے معاشرتی معیارات اور اخلاقی اقدار میں اسلامی روح کا

ہلکا سا عکس بھی باقی رہ گیا ہے؟ کیا اسلامی تمدن کی ادنیٰ سی جھلک بھی موجودہ سوسائٹی میں نظر آتی ہے؟ اسلامی نظام کے قالب میں صرف رُوح کی تازگی اور زندگی کی رونق ہی کم نہیں ہوگئی ہے بلکہ خود یہ قالب بھی مسخ ہوگیا ہے اور ہوتا چلا جارہا ہے۔ ان تمام امور کو سامنے رکھ کر حضرات صوفیا اور اولیائے کرام کے عمل کو بطور سند پیش کرنا موجودہ زندگی اور حالات سے کامل بے خبری پر دلالت کرتا ہے۔

اسی سلسلہ میں ہمیں ایک اور بڑی تبدیلی کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے۔ موجودہ زمانہ میں مملکت اور حکومت کا دائرۂ اقتدار اتنا وسیع اور انسانی زندگی کے مختلف شعبوں پر اس کے اثرات اتنے گہرے اور دوررس ہوگئے ہیں کہ مملکت خود ایک مستقل دین بن گئی ہے جو اپنے دائرۂ اثر میں کسی اور طاقت کے وجود کو برداشت نہیں کرسکتی۔ اور چونکہ اس کا دائرۂ اثر زندگی کے تمام گوشوں پر حاوی ہے اس لئے وہ حقیقتاً مذہب کو کسی گوشہ میں مطلق العنان اور خود مختار نہیں چھوڑ سکتی ہے۔ انیسویں صدی کے ایک انگریزی مدبر لارڈ ملبورن (Lord Melbourne) نے اسٹیٹ کے بڑھتے ہوئے اقتدار پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے اس کے وظائف کے متعلق یہ رائے زنی کی تھی کہ اس کا کام صرف امن عامہ کو برقرار رکھنے اور معاہدات و مواثیق کی تعمیل کرانے تک محدود ہونا چاہئے۔ اور واقعتہً آج سے دو سو برس قبل اسٹیٹ کی غایت وجود اس سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ ایسے اسٹیٹ میں دین و مذہب کسی نہ کسی درجہ میں ایک بااختیار اور قائم بالذات طاقت کی حیثیت سے اپنا کام انجام دے سکتا تھا۔ اس لئے خلافت راشدہ کے خاتمہ کے بعد بھی ایک ہزار سال تک سیاسی نظام کے بگاڑ نے اسلامی تمدن اور اسلامی معاشرت کو وہ نقصان نہیں پہنچایا۔ جتنا گذشتہ سو دو سو سال کے غیر اسلامی تسلط نے اس قلیل عرصہ میں پہنچایا ہے۔ کیونکہ اُس زمانہ میں سیاسی نظام ہمہ گیر نہ تھا اور تمدن و معاشرت کے دائرہ تک سیاسی تبدیلیوں اور سلاطین و امرا کی غیر اسلامی روش کے اثرات پہنچتے پہنچتے اس قدر ضعیف ہو جاتے تھے کہ ان کی وجہ سے اسلامی اقدار اور طرز زندگی کو کوئی بڑا خطرہ لاحق نہیں ہوسکا۔ تعلیم و تربیت کے سارے وسائل اور ادارے حکومت و سیاست کی زد

سے محفوظ تھے ۔ اور ان وسائل پر قبضہ انہیں لوگوں کا تھا ۔ جو اعتقاداً اور عملاً سچے مسلمان تھے ۔ لیکن آج معاملات اس کے بالکل برعکس ہیں ۔ مملکت افراد کی زندگی کے ہر گوشہ پر مسلّط ہے ۔ معاشرت و معیشت سے لیکر تعلیم و تربیت اور خاندانی زندگی کی تشکیل تک اسٹیٹ کے قبضہ اقتدار میں ہے ۔ ریڈیو، سینما، صحافت، مدارس، یونیورسٹیاں، ان میں سے کوئی بھی آزادانہ اور خود مختارانہ طور پر اپنا کام انجام نہیں دے سکتا ۔ مختصر یہ کہ انسانی افکار و نظریات اور تمدنی اقدار و غایات کی تشکیل پر مملکتی اقتدار کا اثر اس قدر مضبوطی سے جما ہوا ہے ۔ کہ کوئی فرد آزادی کی فضا میں سانس نہیں لے سکتا ۔ اسٹیٹ جو عقائد و تخیلات افراد پر عائد کرنا چاہتا ہے بغیر کسی جبر و اکراہ اور بلا کسی تشدّد کے اپنے وسائل نشر و تبلیغ اور تعلیمی پالیسی کے ذریعہ عائد کر دیتا ہے ۔ نظری حیثیت سے افراد آزاد ہیں کہ جو عقائد چاہیں اختیار کریں، جو دین چاہیں قبول کریں اور جو طریق زندگی انہیں پسند ہو اس پر عمل پیرا ہوں، لیکن عملی حیثیت سے اسٹیٹ کی قوتِ قاہرہ ان پر مسلّط ہے اور ان کے افکار و تخیلات کی تکمیل کو جس طرف چاہتی ہے موڑ دیتی ہے ۔ آزادیِ فکر و عمل کا بس نام ہی باقی رہ گیا ہے ۔ باقی ہر حیثیت سے انسان اس نئے اِلٰہ کا بے بس اور مجبور غلام ہے ۔ آپ کتنے ہی آزاد فکر اور آزاد رو ہوں ۔ لیکن اس فضا کو کیا کریں گے جو آپ کو ہر طرف گھیرے ہوئے ہے ؟ مدرسہ میں، اخبارات میں، ریڈیو پر، غرض ہر جگہ آپ کے کانوں میں وہی باتیں پڑیں گی جو اسٹیٹ کے مفید مطلب ہوں ۔ اس صورت حال کے پیش نظر اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ موجودہ زمانہ میں ہم اپنے مذہب اور دین و ایمان پر ثابت قدم رہ سکتے ہیں تو یہ اس کی کم عقلی اور نارسائی فہم کی دلیل ہے ۔ حضرات صوفیاء اور اولیائے کرام کے عہد میں نہ تو اسٹیٹ کی یہ نوعیت تھی اور نہ اس کا یہ ہمہ گیر اقتدار تھا ۔ اس لئے اعمال صالحہ کی تلقین اور انفرادی تزکیۂ نفوس کے کام کو انہوں نے کافی سمجھا تو یہ کوئی بڑی غلط فہمی نہ تھی ۔ لیکن فی زمانہ یہ کام کبھی سرسبز نہیں نہیں ہو سکتا ۔ جب تک کہ آپ اپنے ماحول اور اقدار حیات سے لڑ کر ان کو بالکل بدل نہ دیں ۔

(۵)

گذشتہ دو چار صدیوں سے مسلمانوں پر جو پست ہمتی، بے حسی اور مرعوبیت چھائی ہوئی ہے۔ اُس کا ایک ہلکا سا عکس ہمیں قربِ قیامت کے مروجہ تخیل میں ملتا ہے۔ جس نے مسلمانوں کی عملی قوتوں کو بُری طرح مجروح کر رکھا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ احادیث میں قرب قیامت کے جو آثار بتائے گئے ہیں وہ آج پوری طرح نمایاں ہیں، کوئی تعجب نہیں ہے۔ اگر اس زمانہ میں ہر طرف کفر و شر کی طاقتوں کا غلبہ ہے اور اسلام کا علم سرنگوں ہو گیا ہے۔ قرب قیامت کا یہ تخیل مسلمانوں میں ہمیشہ رہا ہے لیکن موجودہ شکل میں اس تخیل نے اس وقت سے زور باندھا جب سے مسلمانوں کے عوام اور رہنماؤں میں سے مجاہدانہ زندگی کا ذوق اور راہ حق میں صعوبتیں برداشت کرنے کا حوصلہ کم ہونا شروع ہوا۔ اپنی کمزوری اور بے عملی پر پردہ ڈالنے کیلئے مسلمان عوام اور اُن کے مذہبی رہنماؤں نے غیر شعوری طور پر اس خیال کی اشاعت کی کہ اب قیامت کے آثار ہر طرف سے ظاہر ہوتے جا رہے ہیں۔ اور کفر و شر کی قوتوں کا عام غلبہ خود ان علامتوں میں سے ہے جو قربِ قیامت کے وقت نمودار ہوں گی، اس لئے دینِ حق کے قیام اور اسلامی نظام کے غلبہ کا خیال ہی ترک کر دینا چاہئے۔ جہاں تک احادیث کا تعلق ہے اُس زمانہ کے آثار و علائم کی بابت احادیث میں یقیناً بہت کچھ بتایا گیا ہے جب قیامت نزدیک ہوگی۔ لیکن نہ تو اس زمانہ کا کوئی تعین کیا گیا ہے۔ اور نہ احادیث میں ہمیں کوئی ایسی قطعی بات ملتی ہے جس کی بنا پر تیقن کے ساتھ کہہ سکیں کہ وہ زمانہ جس کا احادیث میں تذکرہ ہے۔ ہمارا ہی زمانہ ہے۔ باقی رہا قیامت کا آنا تو وہ برحق ہے۔ لیکن کسی مسلمان کی یہ جرأت نہیں ہو سکتی کہ وہ قیامت کی ٹھیک ٹھیک تاریخ معین کرے یا یہ بتا سکے کہ آئندہ سو دو سو برس میں قیامت ضرور آجائے گی۔ ممکن ہے کہ قیامت کل ہی آجائے اور یہ سارا ہنگامۂ کائنات یکسر معدوم ہو جائے، اور اس کا بھی امکان ہے کہ قیامت آئندہ پانچ چھ ہزار برس تک نہ آئے۔ احادیث میں جو آثار قیامت بتائے گئے ہیں ان میں سے بعض آج سے بہت پہلے ظاہر ہو چکے تھے۔ بعض اس زمانہ میں ظاہر ہو رہے ہیں، اور اکثر آثار ابھی بطنِ مستقبل میں پوشیدہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرب و بعد کے تمام انسانی تصورات

اضافی ہیں۔ جو وقت ہمارے لئے صدیوں اور قرنوں کے طول رکھتا ہے وہ خدا کے شمار میں ایک یوم یا چند ایام سے زیادہ نہیں ہے۔ خود صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اپنے زمانہ میں قیامت کے منتظر رہا کرتے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے ایک منٹ کے لئے بھی یہ خیال نہیں کیا۔ کہ اب کفر و شرک کی طاقتیں غالب رہیں گی اور مسلمان مغلوب و مقہور ہو جائیں گے۔ قیامت کا خوف کرتے ہوئے بھی اُنہوں نے نہ تو کفر کے استیصال سے ہاتھ کھینچا، نہ ان پر کفر کا رعب طاری ہو سکا اور نہ اُن کے عزمِ جہاد اور اعلاء کلمۃ اللہ کی خواہش میں یہ خیال کوئی رکاوٹ پیدا کر سکا۔ لیکن آج اس تخیل نے مسلمانوں میں عجز و بے چارگی کا احساس پیدا کر دیا ہے۔ اور اُن کے ذہن میں یہ غلط خیال جم گیا ہے کہ چونکہ قیامت کا زمانہ قریب ہے۔ اس لئے کفر و اسلام کی کشمکش میں غلبہ کفر ہی کو حاصل رہے گا۔ حالانکہ کوئی بڑے سے بڑا صوفی اور مجتہد تیقن سے نہیں کہہ سکتا ہے کہ وہ زمانہ یہی ہے۔ جس کے آثار احادیث و روایات میں بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر اسلام ہی کائنات کی سب سے بڑی صداقت اور زندگی کا مکمل ترین نظام ہے تو کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ وہ کفر و شرک کی طاقتوں کے سامنے اس طرح کمزور اور سرنگوں رہے۔ یقیناً اُس کائنات میں کوئی بنیادی نقص یا تضاد ہے۔ جس میں باطل کو حق پر مستقل اور دیرپا فتح حاصل ہو جائے۔ اس میں شک نہیں کہ کفر و اسلام اور حق و باطل کی آویزش میں کبھی میدان ایک کے ہاتھ رہتا ہے۔ اور کبھی دوسرے کے۔ دنیا میں خیر و شر کی ازلی کشمکش ہمیشہ جاری رہے گی۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ اس معرکہ آرائی میں باطل کو حق سے زیادہ فتح مندیاں نصیب ہوں۔ اگر گذشتہ دو چار صدیوں سے اسلامی نظام کے مقابلہ میں کافرانہ تہذیب و تمدن کا بول بالا رہا ہے تو اس سے یہ بات اور یقینی ہو جاتی ہے۔ کہ اب اسلام کی باری ہے۔ اور باطل کا علم سرنگوں ہو کر رہے گا۔ البتہ حق کی فتح اور کفر و شر کی شکست و ناکامی صرف ہماری جد و جہد، سعی و عمل اور ایثار و سرفروشی سے ہو سکتی ہے۔ نہ کہ

عالمانہ قیل و قال اور صوفیانہ وجد و حال سے ۔

قربِ قیامت کا تذکرہ کرتے ہوئے لوگ بڑی آسانی سے یہ بھول جاتے ہیں ۔ کہ احادیث میں ایک ایسے زمانہ کا ذکر بھی آیا ہے ۔ جب اعدائے حق مغلوب ہوں گے ۔ خدا کا کلمہ اس کی زمین پر سب سے زیادہ بلند ہوگا ۔ اور دُنیا پھر ایک بار خیر القرون کی سعادتوں اور مسرتوں سے معمور ہو جائے گی ۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ بغیر جان و مال کی قربانی اور طویل جدوجہد کے از خود واقع نہیں ہوگا ۔ اس کائنات میں اسباب و مؤثرات سے ہٹ کر کوئی کام نہیں ہوتا ہے ۔ یہ تخیل بالکل بے معنی ہے کہ بس یکایک مہدی علیہ السلام کا ظہور ہوگا اور ساری دنیا میں کفر و فساد کی قوتیں خود بخود سرنگوں ہو جائیں گی ۔ دُنیا میں ایسی تبدیلیاں نہ کبھی ہوئیں ہیں نہ ہوں گی ۔ اسلام کا آغاز ، اس کا عروج اور اس کی کامیابیاں بھی مادی حالات و اسباب کے تحت ہوئی تھیں ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو وہ سارے اسباب و وسائل مہیا کرنے پڑے جو اس عالمِ اسباب میں کامیابی اور فیروز مندی کے ضروری شرائط ہیں ۔ اگرچہ عہدِ رسالت میں مسلمانوں کو جو کامیابیاں حاصل ہوئیں ۔ وہ سب تائیدِ ایزدی اور مشیئتِ الٰہی کے تحت ہوئیں ، لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ انہیں بھی وہ سب کچھ کرنا پڑا جو ان کی جگہ کسی اور جماعت یا گروہ کو کرنا پڑتا ۔ لیکن مہدی کے متعلق مسلمانوں میں یہ عجیب تخیل پیدا ہو گیا ہے کہ بس اُن کے آنے کی دیر ہے اور بلا کسی کوشش و مشقت کے کفر و شر کی طاقتیں اپنی شکست مان لیں گی ۔ خرقِ عادت اور کرامات سے دُنیا میں کوئی انقلاب نہیں ہوا ہے ۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی یہی ہے کہ انسان جو کام بھی کرے اُن قوانین کے اندر رہ کر کرے ۔ جن پر اس نے فطرتِ انسانی اور فطرتِ کائنات کی تخلیق کی ہے ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انبیاء کو اپنے مخالفین سے کشمکش اور ان کے خلاف صبر آزما مشقتوں اور قربانیوں کی ضرورت نہ پیش آتی ۔ بس نبی کے پیدا ہوتے ہی زمین و آسمان بدل جاتے ۔ اگر پہلے

ایسا نہیں ہوا تو ظاہر ہے کہ امام مہدی علیہ السلام کے زمانہ بھی ایسا نہ ہو گا۔ ان کو بھی وہی سب کچھ کرنا ہوگا۔ جو حضور رسالت مآب نے کیا یعنی وہ تمام اسباب و مؤثرات فراہم کرنے ہوں گے جن سے اسلام کو ایک غالب طاقت بنایا جا سکے۔

ان تمام امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر آج اسلامی نظام کو عملی حقیقت بنانے کی جدوجہد شروع کی جائے تو کیا اس سے مہدی کے لئے راہ ہموار نہ ہو جائے گی۔ ممکن ہے کہ ہم اپنی کمزوریوں اور نقائص کی وجہ سے اسلامی نظام کو عملاً غالب نہ کر سکیں لیکن کیا ہماری جدوجہد کے نتائج مہدی کی کوششوں کے لئے بے اثر رہیں گے اور ہم موجودہ پست حالت سے نکل کر بلند تر مدارج کے حصول میں کامیاب نہ ہوں گے؟ اور حقیقت تو یہ ہے کہ راہِ خدا میں سعی و عمل کی ناکامی کا تصور ہی غلط ہے۔ اس راہ کی ناکامی بھی کامرانی اور فیروزمندی کی سب سے قیمتی متاع ہے۔

"در سارا حصول عشق کی ناکامیوں میں ہے جو عمر رائیگاں ہے وہی رائیگاں نہیں"

راہ حق میں قربانی اور جدوجہد کے نتائج ہماری ظاہری نظر میں کتنے ہی مایوس کن ہوں۔ لیکن ان کی فتح مندی ایک اٹل حقیقت ہے۔ کائنات میں یوں تو کوئی عمل ایسا نہیں ہے جو اپنے نتائج نہ رکھتا ہو لیکن وہ عمل یقیناً بے نتیجہ نہیں ہو سکتا ہے۔ جس کے پس پشت رضاء الٰہی کی طلب اور دین حق کی محبت کا جذبہ کارفرما ہو۔

(۶)

جب اسلام کو ایک نظام تمدن اور ضابطۂ حیات کی حیثیت سے دنیا پر غالب کرنے کا نام لیا جاتا ہے اور اسی کی طرف دعوت دی جاتی ہے تو بعض حضرات کی طرف سے یہ اعتراض اٹھایا جاتا ہے۔ کہ مذہب کو ایک دنیوی تحریک بنا کر مت پیش کرو۔ اسے ملکی اقتدار اور دنیوی سربلندی کا ذریعہ نہ بناؤ۔ دین و مذہب ایک روحانی حقیقت ہے جو مادی غلبہ اور تمدنی اقتدار کے بغیر بھی اپنا کام کرتی

رہتی ہے۔ دنیوی اقتدار دین میں فی نفسہٖ مطلوب نہیں ہے بلکہ وُہ ایک انعام ہے جو دینداری کے نتیجہ میں عطا ہوتا ہے، لہٰذا اسے حاصل کرنے کی سعی نہ کرنی چاہئے۔ بلکہ صرف دیندار بن جانا چاہئے۔

اس اعتراض میں دو مغالطے ہیں۔ ایک روحانیت کا سراسر غیر اسلامی تخیل، اور دوسرا مذہب کو دنیوی اقتدار کے لئے وسیلہ بنانے کا خود ساختہ الزام۔

روحانیت فی الواقع انسان کی مادی زندگی سے الگ ہو کر کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ مسلمان کا ہر دنیوی عمل روحانی عمل ہے بشرطیکہ وُہ اسلام کے اخلاقی اقدار و غایات کے تابع ہو۔ وُہ روحانیت نہیں بلکہ رہبانیت ہے جو انسان کی مادی اور عمرانی زندگی سے اپنا رشتہ منقطع کرلے۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں میں روحانیت پیدا نہیں ہوتی۔ جو نماز روزہ اور درود و وظائف میں اس قدر زیادہ منہمک ہو جاتے ہیں کہ انہیں اپنے گرد و پیش کی بھی خبر نہیں رہتی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے روم و ایران کی فتوحات کے وقت فوجی تنظیم، لشکرکشی اور دیگر انتظامات میں جو وقت صرف کیا وُہ یقیناً غیر دینی اور غیر روحانی عمل میں صرف نہیں ہوا تھا۔ مفتوحہ ممالک کے نظم و نسق، بیت المال کے انتظام اور ملکی امور کے انصرام کے سلسلہ میں انہوں نے جو کچھ کیا وُہ محض دنیاداری نہ تھی۔ جو وقت وُہ معاشی کاموں میں صرف کرتے تھے اور جس میں وُہ اپنے اہل و عیال کی طرف مشغول ہوتے تھے۔ وُہ بھی غیر دینی عمل میں ضائع نہ ہو جاتا تھا۔ اگر ان سب اشغال کو چھوڑ کر وہ اپنا سارا وقت تہلیل اور درود و وظائف میں صرف کرتے تو اس سے اُن کی روحانیت میں کوئی اضافہ نہ ہوتا۔ بلکہ حقیقی اسلامی روحانیت سے وُہ محروم ہو جاتے۔ کوئی دنیوی کام جب جذبۂ دینی کے تحت اور اسلامی نصب العین کی محبت میں کیا جائے تو پھر وُہ دنیا کا کام نہیں رہتا بلکہ عین دینی کام ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے دنیاداری یہ ہے کہ ایک طرف ہم نمازیں پڑھیں، عبادات کریں، اور خدا کی محبت کا دعویٰ کریں اور دوسری طرف ہم کفر و شرک کی طاقتوں سے مداہنت کریں، کافرانہ تہذیب کے غلبہ پر راضی رہیں اور ارباب اقتدار کی

برائیوں اور ناحق شناسیوں کو خاموشی سے دیکھا کریں کہ مبادا اظہار حق سے ہمیں نقصان پہنچ جائے۔

رہا یہ سوال کہ مذہب کو دنیوی سربلندی کا ذریعہ نہ بنایا جائے تو اس کے متعلق صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ اسلامی نظام کے غلبہ کی خواہش، دنیاوی اقتدار کی ہوس سے بالکل ایک مختلف چیز ہے۔ اور ان دونوں کو خلط ملط کر کے ان پر ایک حکم لگا دینا سخت غلطی ہے۔ جو لوگ اپنے شخص یا خاندان یا قومی اقتدار کے خواہشمند ہوتے ہیں، انہیں اقتدار نصیب ہوتا ہے، تو یہ وہ انعام نہیں ہے۔ جو دینداری کے نتیجہ میں حاصل ہوا کرتا ہے، بلکہ یہ خالص دنیا پرستی کے نتیجہ میں حاصل ہونے والا انعام ہے، اور اس سے کل کے فراعنہ اور آج کے انگریز، امریکن، جرمن، روسی، سب بہرہ ور ہیں۔ بخلاف اس کے جس اقتدار سے غرض یہ ہو کہ کفر کا غلبہ مٹے اور خدا کی زمین پر خدا کا دین غالب ہو اس کے مقصود و مطلوب ہونے سے صرف وہی لوگ انکار کر سکتے ہیں جو دینِ اسلام کو محض سطحی طور پر جانتے ہیں، اس کی رُوح سے واقف نہیں ہیں۔ پھر تعجب یہ ہے کہ یہ اعتراض ان لوگوں کے خلاف کیوں نہیں کیا جاتا ہے۔ جو علانیہ دنیوی اور سیاسی برتری کو مقصود بنا کر اس کے حصول کیلئے جائز و ناجائز طریقوں سے کوشاں ہیں اور جو دین و مذہب کو صرف عام مسلمانوں کی ہمدردی حاصل کرنے اور ان میں وقتی جوش پیدا کرنے کیلئے ایک آلہ کار بنائے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کی موجودہ سیاسی جدوجہد بجز دنیوی اقتدار اور قومی برتری کے حصول کی خواہش کے اور کس جذبہ پر مبنی ہے؟ کیا اس پوری سیاست میں کہیں جذبہ دینی کارفرما نظر آتا ہے؟ کانگرس کے ہمخیال علماء کو چھوڑ کر، جنہیں محض اپنی سیاسی گروہ بندی کی بناء پر ارباب مسلم لیگ سے نفرت ہے اور کسی عالم دین کو ارباب لیگ سے یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوتی کہ "خدا را اپنے دنیوی اور قومی مفاد کے حصول کو مذہبی رنگ نہ دو۔ اگر تم اپنی قومی بڑائی چاہتے ہو اور دنیوی اقتدار کے خواہاں ہو تو اس کے لئے ضرور ہاتھ پاؤں

مارو۔ مگر اس دنیا طلبی میں اسلام کا نام بیچ میں نہ لاؤ۔ تمہاری زندگی، تمہارے طریقہ کار اور انداز فکر کو اسلام سے کیا مناسبت ہے۔ مسلمانوں کو اسلام سے جو تھوڑی بہت محبت رہ گئی ہے۔ اس سے فائدہ اٹھانے کیلئے تم اسلامی تہذیب اور اسلامی حکومت کا نام لیتے ہو، حالانکہ تمہارے غیر اسلامی طرز عمل اور دنیا داری کی روش سے اغیار اور ہندو ہم وطنوں میں اسلام کی بدنامی ہو رہی ہے۔ ان کے ذہن اسلامی حکومت اور مسلمان قوم کی حکومت میں فرق کرنے سے قاصر ہیں۔ وہ جب تمہاری سیاسی بازی گری دیکھتے ہیں اور اس کے ساتھ اسلام کا نام سنتے ہیں تو ان دونوں کو خلط ملط کر دیتے ہیں۔" اس کے برعکس جب مذہبی اقدار و غایات کے حصول اور صحیح اسلامی زندگی کی تشکیل کے لئے سیاسی اور دنیاوی اقتدار کے حصول کا نام لیا جاتا ہے تو کہا جاتا ہے۔ کہ اسلام کو دنیوی تحریک مت بناؤ۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ اگر خالص دنیوی اغراض و مفاد کے حصول کے لئے مذہب کو وسیلہ بنا لیا جائے اور سیاسی اقتدار کی جدوجہد میں اسے بطور آلۂ کار استعمال کیا جائے تو یہ بالکل جائز اور درست ہے، لیکن اگر دنیوی اقتدار کے حصول کو مذہبی اغراض و مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی جائے اور دین حق کو سربلند کرنے اور اسے ایک کارفرما حقیقت بنانے کیلئے سیاسی طاقت اور حاکمانہ اختیارات بطور وسیلہ مطلوب ہوں تو یہ مذہب کو ایک دنیوی تحریک میں تبدیل کرنے کے مترادف ہے! " بہ سوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست"

(۷)

دنیا آج جن انقلابی قوتوں کے تصادم اور کشمکش کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے وہ سب کی سب اندھی قوتیں ہیں۔ جن میں نہ تو فہم حقیقت اور عقل و دانش کی روشنی ہے اور نہ انسانیت کی منزل مقصود کا کوئی نشان۔ یہ تمام قوتیں وقتی حالات اور ہنگامی تقاضوں سے وجود میں آئی ہیں اور اس وقت تک دنیا میں فساد برپا کرتی رہیں گی اور انسان کو فریب آرزو میں مبتلا رکھیں گی۔ جب تک کہ یہ حالات ختم

نہ ہو جائیں یا اسلام ایک تازہ اور جاندار طاقت بن کر انہیں تباہ و برباد نہ کر دے۔ لیکن اپنی کور چشمی اور بے بصری کے باوجود ہیں بہرحال یہ قوتیں، اور قوت کا مقابلہ قوت ہی سے کیا جا سکتا ہے، نہ کہ ضعف و بے چارگی سے۔ ہمارا موجودہ مذہبی نظام ان قوتوں کا حریف نہیں ہو سکتا، اس لئے نہیں کہ وہ ان کے مقابلہ میں صداقت کے عنصر سے خالی ہے یا اس کے بنیادی اصول بہتر نہیں ہیں بلکہ محض اپنی روح کی پژمردگی اور طاقت کی کمی کے باعث۔ ہماری مذہبی زندگی کا رشتہ اس سرچشمہ سے ٹوٹ گیا ہے۔ جہاں سے اُسے قوت اور زندگی حاصل ہوتی تھی۔ یہ سرچشمہ حیات ایمان باللہ اور آخرت کا یقین ہے۔ جس کے فقدان نے ہمارے مذہبی اعمال کو بے روح بنا دیا ہے۔ ایمان باللہ صرف زبان کے اقرار سے حاصل نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ یقین کی شدت سے پیدا ہوتا ہے۔ اور یقین کی یہ شدت اب ہمارے اندر باقی نہیں رہی ہے۔ جس طرح درخت کی مضبوطی اور زندگی جڑوں کی طاقت پر منحصر ہوا کرتی ہے اور جڑوں ہی سے درخت کو اپنی پوری نشو نما کا سامان ملتا ہے۔ اسی طرح مذہب دنیا میں ایک زندہ اور کارفرما قوت کی حیثیت سے اسی وقت ابھرتا ہے جب اس کے پیروؤں کے دل و دماغ ایمان کی روشنی سے منور اور یقین کی پختگی اور شدت سے مالامال ہوں۔ کیونکہ ایمان ہی وہ مرکز قوت ہے جس سے مذہبی نظام کے مختلف اجزاء ترکیبی اپنی زندگی اور قوت کیلئے غذا اور سامان حاصل کرتے ہیں۔ جب اس نظام کی شاخیں اپنے مرکز قوت سے منقطع ہو جاتی ہیں اور ایمان کی قوت محرکہ کمزور پڑ جاتی ہے تو پھر سارے مذہبی اعمال زندگی کی روح اور جذبات کی طاقت سے محروم ہو جاتے ہیں اور مذہب میں میکانیت، ضابطہ پرستی اور ظاہر پسندی کے صفات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ جو جذبہ مذہبی کے کمزور ہو جانے کی علامتیں ہیں۔ آج مسلمان نماز بھی پڑھتا ہے، حج بھی ادا کرتا ہے، سال میں ایک دو مرتبہ ذکر میلاد بھی منعقد کرتا ہے اور دل میں کئی ایک بار خدا کا نام بھی لیتا ہے۔ لیکن یہ سب محض رسمی

طریقہ پر۔ ایمان کا حقیقی جذبہ کہیں نظر نہیں آتا۔ کیونکہ ایمان کا لازمی نتیجہ عمل صالح ہے۔ وہ یقین ہی نہیں جس کے اثرات براہِ راست انسانی زندگی میں نمایاں نہ ہو جائیں۔

"رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے"

آج جس چیز کو ایمان کہا جاتا ہے وہ حقیقتاً ایمان نہیں بلکہ اقرارِ لسانی ہے یا اسے زیادہ سے زیادہ عدمِ انکار کہا جا سکتا ہے۔ مصیبت کے وقت خدا کو پکارنا ایمان کی دلیل نہیں۔ ایمان یہ ہے کہ مصیبت ہو یا راحت، تنگی ہو یا فراخی، دل اس کی یاد سے غافل نہ رہے اور زبان اس کے ذکر سے خالی نہ ہو۔ ایمان یہ ہے کہ خدا کا تصور اور اس کی محبت ہماری زندگی اور وجود کے ہر گوشہ اور اعمال کی ہر شاخ میں اس طرح دائر و سائر ہو جس طرح خون رگوں میں گردش کرتا ہے۔ والذین آمنوا اشد حباً للہ (اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں انہیں سب سے زیادہ اللہ سے محبت ہوتی ہے)۔ والذین یذکرون اللہ قیاماً و قعوداً و علیٰ جنوبھم (اور یہ لوگ ہیں جو خدا کو کھڑے بیٹھتے اور لیٹتے ہر وقت یاد کرتے ہیں)۔

جب خدائے برتر کا یقین اس طرح افراد کے ذہن و قلب پر پیوست ہو جاتا ہے۔ تب اُن کے اندر سے کفر و باطل کی مرعوبیت دھل کر نکل جاتی ہے اور وہ انقلابی قوت وجود میں آتی ہے جو شر کو کسی درجہ میں بھی گوارا نہیں کرتی اور ظلم و ناحق شناسی سے کسی قیمت پر بھی مصالحت نہیں کرتی۔ عہدِ رسالت اور صحابہ کرام کے زمانہ میں مذہب ایسی ہی انقلابی قوت تھا اور یہی انقلابی روح تھی جو دیکھتے دیکھتے ریگ زارِ عرب سے نکل کر اطرافِ عالم پر چھا گئی۔ اور جہاں پہنچی وہاں سے برائی ظلم، ناانصافی اور استعمالِ ناجائز کا قلع قمع کر دیا۔ اس نے کبھی شر سے مداہنت نہیں کی۔ اس نے کہیں اقتدار کے ظلم اور طاقت کی ناانصافیوں کو روا نہ رکھا۔ جب تک ہم مذہب کو پھر سے ایک انقلابی قوت میں تبدیل نہ کریں اور اس روح انقلاب کا عملی مظاہرہ

دُنیا کے سامنے پیش نہ کردیں اس وقت تک نہ ہماری نمازیں اور دعائیں اسلام کو فائدہ پہنچا سکتی ہیں اور نہ مذہب کی خوبیوں پر فصیح و بلیغ تقریروں اور کتابوں کے انبار سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کی گراں گوشی متاثر ہوگی۔ دنیا و دین کی برکتیں اور سعادتیں ان لوگوں کو نصیب ہونگی جنہیں محبت کا جنون اور عشق کا سودا ہے۔ جن کے قدم منزل کی جستجو میں سکون و راحت سے ناآشنا ہیں۔ جن کا عزمِ بلند اسلام کو ایک عالم گیر قوت اور ایک زندہ اور کارفرما حقیقت سے کم کسی حیثیت میں دیکھنے پر راضی نہیں ہے۔

بہشتے بہرِ اربابِ ہمم است — بہشتے بہرِ پاکانِ حرم است
بگو ہندی مسلمان را کہ خوش باش — بہشتے فی سبیل اللہ ہم است

بقیہ رسائل و مسائل

کون ہے، جو اس ناجائز خدمت پر تمہارا احسان مند ہوگا۔ اور کس سے اس بیجا سعی پر صلہ کی توقع رکھتے ہو؟ وہ غیر الٰہی نظامِ حکومت، جس کے ایک جز کی حیثیت سے آپ لوگ کام کررہے ہیں، بجائے خود ناپاک ہے۔ اس کی حیثیت بالکل خنزیر کے نظامِ جسمانی کی سی ہے، جس کی بوٹی بوٹی اور رگ رگ میں حرام سرایت کئے ہوئے ہے۔ اس کے کل پرزے بن کر آپ لوگ پہلے ہی گناہِ عظیم میں مبتلا ہیں، اب اس پر خیانت اور رشوت، اور باطل طریقوں کے ارتکاب کا اضافہ کرکے اپنے آپ کو کیوں مزید خطرے میں ڈالتے ہیں؟ کیا کبھی موت آنی ہی نہیں ہے؟ یا مرنے کے بعد کوئی جائے پناہ تجویز کررکھی ہے، جہاں خدا کی پکڑ سے بچ جانے کی امید ہے؟

اجتماعیت کی شیرازہ بندی

تاریخ عالم کی صالح ترین معیاری اجتماعیت

دوسرا باب

(از ڈاکٹر عبد القوی لقمان صاحب)

انسانی برادری نے تاریخ کے مختلف ادوار میں اجتماعی زندگی گذارنے کے لئے کئی گھروندے بنائے اور متنوع اور بوقلموں نقشوں پر ملّی اور سماجی تعمیریں اٹھائیں۔ ہر عمارت میں حسنِ تکوین اور زیب منظر کی جدا جدا شان تھی۔ اور جماعتی تنظیم کے نئے نئے تجربوں کی آزمائش ہوئی لیکن سرد ارزمان نے ان کے عیوب اور خامیوں کو ننگا کر دیا۔ اور قدرت کی شان و شوکت کا پلستر جھڑتے ہی سب رخنے منظر عام پر آگئے۔

اجتماعیت کا جو نقشہ تمام محاسن پر حاوی اور تمام خامیوں سے مبرا نکلا۔ وہ وہی تھا جسے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کی بے آب وگیاہ زمین سے اٹھایا تھا۔ اور تاریخ کے دفاتر شہادت دے رہے ہیں کہ اس معیار کا جواب نہیں پیدا ہوا۔

(۱) اس اجتماعیت کے دروازے ساری انسانی برادری کے لئے کسی نسلی۔ لسانی، تمدنی یا معاشرتی تمیز کے بغیر کھلے تھے۔ عرب اور ایرانی، حبشی اور رومی سگے بھائیوں کی طرح باہم محبت و پیار سے رہتے تھے اور ان کے مجلسی اعمال یا سماجی طریقوں پر اونچ نیچ، بلند و پست یا شریف و رذیل کی پرچھائیں تک بھی پڑنے نہ پاتی تھی:۔ اسلام کے ظہور سے پہلے قرشی عرب اپنی نسلی شرافت کے بارے میں کبر و نخوت کی عجیب و غریب مثالیں پیش کیا کرتے۔ اپنی بیٹیوں کو اس لئے پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دیتے کہ کوئی ان کا داماد نہ بننے پائے اور فصیح و بلیغ قصیدوں میں اپنے بزرگوں کے

مناقب وفضائل اور مفاخر و محاسن کے بارے میں مبالغہ واغراق کی تمام حدود سے تجاوز کرنا ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ اور اپنی قومی زبان آوری کا اس قدر غرور رکھتا کہ اپنے مقابلہ میں باقی دنیا کو عجمی (گونگے) کہہ کر پکارتے تھے۔ لیکن یہی قرشی عرب اسلام کی جماعتی روح میں سمٹ جانے کے بعد بلال جیسے حبشی النسل غلام اور غریب الوطن سلمان فارسی کے عقد میں اپنی جگر گوشہ لڑکیاں پیش کرتے ہوئے انتہائی طمانیت قلب اور روحانی فرحت و انبساط محسوس کرتے۔

(۲) اراکین جماعت کے باہمی نظم و ضبط کا یہ حال تھا کہ ہر شخص اپنے دل و دماغ کی قابلیت یا جسمانی قوٰی کے اعتبار سے جماعتی نظام کے اندر جس منصب کے لائق تھا، اس کی ذمہ داری اسے سونپ دی گئی، اور اس نے عمر بھر اپنی جسم و جان کی پوری قوت سے ہر ممکن طریق پر اسے نباہا۔ اقتدار اعلیٰ، آمر، امیر یا واجب الاطاعت لیڈر کا منصب اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا جنہوں نے وحی الٰہی کے تحت جماعت کا ڈھانچا بنایا۔ نظم و ضبط اور اجتماعی ڈسپلن کا آئین سب کو سمجھایا اور عمل در آمد کرایا۔ اس دماغ کے تحت تقوٰی و طہارت کے پیکر حضرت ابوبکر اگر جماعت کا دل تھے، تو فراست سراپا اور سیاست و نقاہت کا مجسمہ حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان غنی ذی النورین جن کی دولت و ثروت اسلام کے دور غربت میں جماعتی نظام چلانے اور اس کے اعضا کو زندہ رکھنے کا واحد اہم ذریعہ تھی اور خود حلم و حیا اور قرابت داروں کے لئے شفقت و راحت کا نادر نمونہ تھے اور اسی طرح علم و عرفان اور قوت و شجاعت کے بطل جلیل حضرت علی کرم اللہ وجہہ سب اس جسم کے اعضائے رئیسہ تھے جس کا نام قرن اول کی اسلامی جماعت ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ اس دور کے مسلمانوں نے انفرادی معاملات میں بے نفسی، صبر و شکر اور اجتماعیت کے لئے تن من دھن قربان کر دینے کی جو عملی اور واقعی مثالیں چھوڑی ہیں وہ دنیا میں اپنی نظیر نہیں رکھتیں۔

(۳) اشتراکی نظام

مکہ کے مظلوم مسلمانوں کی ایک جماعت اپنی قوم اور خون کے رشتوں کو تج کر، اپنے گھروں کے آرام و آسائش سے بے نیاز ہو کر، ماں باپ کی آغوش شفقت اور بہن بھائیوں کی محبت سے کنارہ کش ہو کر، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر جماعت کی شیرازہ بندی کی خاطر مدینہ کو ہجرت کر گئی تو وہاں کے مسلمان ان کے انصار و مددگار بن گئے اور انہیں اپنے سر آنکھوں پر جگہ دی اور حقیقی بہن بھائیوں کی طرح اپنے گھروں کے آرام اور ساز و سامانِ معیشت میں، مال و املاک کی ملکیت میں، کھیتی باڑی اور تجارت میں برابر کا شریک کر لیا یہی نہیں بلکہ اگر ایک کا انتقال ہو جاتا تو حقیقی عزیزوں کی طرح دوسرا اس کا وارث بنتا۔ اگر کسی خاص انصاری کے عقد میں ایک سے زیادہ بیویاں تھیں تو اس نے انہیں طلاق دے کر غیر متاہل مہاجر بھائیوں کی زندگی میں شریک ہونے کی ضمیر کی پوری راحت کے ساتھ اجازت دے دی۔ انہوں نے اپنے سارے ماسبق رشتے بھلا دیئے تھے صرف ایک ہی رشتہ یعنی جماعت اسلام کی اخوت کی لگن باقی رہ گئی تھی۔ سب اللہ کے رسول کے فدائی تھے، اور اسی کے جمالِ جہاں آرا پر اپنا سب کچھ نثار کر دیتے۔

تو نخل خوش ثمر کیستی کہ باغ و چمن ہمہ ز خویش بریدند و در تو پیوستند

یہ مجیر العقول اشتراکیت فقط وقتی اور عارضی نہ تھی بلکہ ایسا مستقل آئین بنایا گیا جس میں محتاجوں اور بے کسوں کی نگرانی اجتماعی نظام نے اپنے ذمے لی اور امرا اور ذی حیثیت افراد سے لازمی ٹیکسوں کے ذریعے اسے پورا کیا۔ ہر فرد کو اس بات کا پورا موقع ملا کہ اپنے دل و دماغ کی قوتوں کو کام میں لا کر خوب دولت پیدا کرے، صنعت و حرفت میں تجارت و زراعت میں زیادہ سے زیادہ ترقی کرے لیکن ایسے مالی نظام کو رائج کیا جس کی بدولت دولت چلتی، پھرتی، افراد میں بٹتی اور تقسیم ہوتی رہتی اور ایک جگہ یا ایک طبقہ میں محصور رہ کر بانی اجتماعیت کے لئے بیکار نہ کر دی جاتی۔ اس اشتراکی نظام

کے تحت زندگی بسر کرتے ہوئے ہر فرد اپنی سعی و ذہانت کا پھل پاکر دل کے حوصلے نکال لیتا لیکن زندگی کی ضروریات اور سروسامان معیشت سے محروم کوئی بھی نہ ہوتا

(۲) مالی نظام

مالی نظام یا فینانشل سسٹم کے اہم نکات یہ ہیں۔

(ا) انفرادی زندگی کا معیار کھانے پینے کی ہر صاف ستھری اور پاکیزہ چیز اور خدائے تبارک کی پیدا کی ہوئی تمام ایسی نعمتیں جو زیب و زینت اور آرام و آسائش کے کام آتی ہیں۔میانہ روی کے ساتھ ان سے تمتع کرنے اور فائدہ اٹھانے کی اجازت دی گئی، لیکن انتہائی عیش و عشرت کی زندگی رفاہیت بالغہ حرام اور ناجائز قرار دے دی گئی۔ اسراف یعنی بے اعتدال صرف بیجا، اور تبذیر یعنی بے محل خرچ، اور اکتناز یعنی وسائل دولت کو محض جمع اور ذخیرہ کر چھوڑنا حرام قرار دے دیا۔ یہاں تک کہ مردوں کو سونے چاندی کے زیورات یا طلا و دیبا و اطلس کے رنگا رنگ ریشم یا حریر کے نرم و نازک کپڑے ممنوع کر دینے اور کھانے پینے میں سونے چاندی کے برتنوں کے استعمال سے روک دیا۔

(ب) سود کا لین دین جس سے امرا امیر تر اور غربا روز بروز غریب تر ہوتے چلے جاتے ہیں بالکل ختم کر دیا۔

(ج) امراء اور ذی ثروت افراد کے اندوختہ پر زکوٰۃ اور کمانے والوں کی آمد پر عشر کے ٹیکس کے علاوہ عام غربا نوازی اور نوع پروری کو وقت کا فیشن اور اجتماعی رواج بنا دیا۔

(د) ترکہ کی ورثا میں تقسیم کو لازم قرار دے دیا تاکہ ہر شخص کی زندگی کا کمایا ہوا دولت کا انبار کئی حصوں میں اس کے مرتے ہی تقسیم ہو جائے۔ اس اشتراکی فضا میں مالیات کے ایسے نظام کے تحت نہ سرمایہ داری مفاسد کا پیدا ہونا ممکن اور نہ طبقاتی تقسیم اور گروہ بندی کا کسی طرح کا امکان ہے

(ہ) مذہبی اعتبار سے خدائے واحد کی خالص عبودیت اور فطرت کے آئین و قوانین کے تحت،

زندگی گزارنا سکھا کر، سمجھ میں نہ آنے والے وجوبائی عقائد اور انسانوں کو باہم تقسیم کرنے والے اور ایک دوسرے سے نفرت دلانے والے رسم و رواج کی نفی کر کے ساری انسانی برادری کے لئے ایک مرکز پیدا کر دیا اور تمام اختلافی اور انشقاقی گروہ بندیاں ختم کر دیں۔

(۶) معاشرتی زندگی اور سماجی جیون کی بنیادیں ایسے طور طریقوں اور رسم و رواج پر رکھی گئیں کہ مفاد کے اختلاف پر جماعت بندی کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی۔ نہ کوئی بھوکا اور بے کار رہا کہ بیکاروں اور بے زوروں کی انجمن بن سکے۔ تجارت پورے ناپ تول اور جائز منافع کے ایسے بے خطا گر پر چلی کہ نہ جماعت سے اس کو شکایت نہ تاجروں کے ہاتھوں عوام نالاں۔ اس لئے نہ بیوپار منڈل بنانے کی ضرورت نہ ٹریڈ یونین یا شیر مارکیٹ اور سٹہ بازار۔ مزدوروں کا سماج میں درجہ برابر اور مزدوروں کا یہ حال کہ سرور کائنات نے حکم نافذ کر دیا کہ مزدور کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اس کی مزدوری اس کے حوالے کر دو۔ اب لیبر یونین بنے تو کیوں اور کسان سبھا کس غرض سے قائم کی جائے؟ لیکن اگر جماعتی مفاد کی تنظیم یا بین الاجتماعی انہام و تفہیم کی خاطر ایسی جماعتیں قائم ہوں گی بھی تو ان کی حیثیت ریل گاڑی کے ڈبوں جیسی ہوگی جو اگرچہ اندرونی کیفیت اور بیرونی رنگ و روغن میں مختلف ہوں اور ان پر جدا جدا عنوان لکھے ہوں لیکن ایک ہی انجن کے پیچھے، ایک ہی پٹری پر اور ایک ہی منزل کو جا رہے ہوتے ہیں۔

(۷) بہم بھی طاقت، مادی اسباب یا سرمایہ داری آمو بینک کے بارے میں اس جماعت کی تاریخی حیثیت پر غور کیجئے۔ اللہ کے رسول نے جماعتی تنظیم کا کام ایسے حالات میں شروع کیا جو مادی اسباب کے فقدان، مال و املاک کی کمی، حرب و ضرب کے ہر قسم کے سامان سے محرومی، عام ضروریات زندگی تک کی نایابی بے کسی اور ناداری کی انتہائی مثال ہے۔ رسول اللہ یتیمی کی حالت میں پیدا ہوئے اور کسی بڑے امیر اور صاحب ثروت گھرانے میں نہیں۔ نہ انہیں کسی بینک یا سرمایہ داری نظام کی پشت پناہی حاصل تھی۔ نہ ان کے زیر کمان کوئی طاقت وہ مسلح جتھہ موجود کہ ان اسباب سے اپنی حکومت یا آمریت قائم کر لیتے

بلکہ اسلام کے اجتماعی نظام کی سب اجتماعی نظاموں پر فوقیت کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے۔ کہ ساز و سامان کے اعتبار سے زیادہ سے زیادہ ناموافق حالات میں جنم لے کر، فقط اپنی اندرونی اور معنوی خوبیوں اور صلاحیتوں کے باعث، اپنی نافعیت اور نوع پروری کی بے پناہ طاقت کے زور سے یہ ایک ننھے سے بیج سے پھوٹنے والے ناتواں پودے کی طرح عالم وجود میں آیا اور موسم کی خشک سالی، مخالفت کی باد سموم اور دشمنی و عناد کے ہیبت ناک طوفانوں اور جھکڑوں کا وقار سے مقابلہ کرتے کرتے ایسا تناور درخت بن گیا جس پر حیرت و استعجاب کا جس قدر اظہار کیا جائے کم ہے۔ اور پھر اس درخت نے ایسے میٹھے، خوش ذائقہ اور حیات بخش پھل پیدا کئے جس کی نظیر کہیں اور نہیں ملتی۔

اس جماعت نے سچائی کے سہارے بے سر و سامانی میں سامان پیدا کیا اور ضعیف ترین افراد کو ایسے صالح نظام کی قوت بخشی، اور صبر و ثبات کے ساتھ سچائی پر مرمٹنے کا ایسا جذبہ پیدا کیا۔ کہ شہر بدر ہونے کے چند برس بعد میدان بدر میں ۳۱۳ کی قلیل اور بے سر و سامان جماعت نے ہزاروں کی مسلح فوج سے ٹکر لے لی اور اس کی طاقت اور غرور و نخوت کا سر توڑ کر رکھ دیا۔ اس دیباچہ کے بعد فتح و اقبال کی فصلیں یکے بعد سامنے آتی گئیں اور تیس برس کی مختصر مدت میں اس اجتماعی نظام کے محاسن فقط جزیرۃ العرب ہی پر ابر رحمت کی طرح نہیں پھیلے اور برسے بلکہ رومی شاہنشاہیت کی آمرانہ کشورکشائی کا تیندوا بھی ان کے سامنے سے ہمہ گیر پاؤں زخمی حالت میں سکڑنے پر مجبور ہو گیا۔

اجتماعیت کے اس نظام کا نقشہ، جو انسانوں کے چھوٹے سے چھوٹے گھرانے سے لیکر محلہ وار، شہری، صوبائی، ملکی یا بین الاقوامی نظام بنانے، سنوارنے، افراد اور جماعتوں کے جھگڑے چکانے، حکومت اور اجتماعیت چلانے کے لئے بہترین سیرت اور کیریکٹر پیدا کرنے کی بہترین صلاحیت رکھتا ہے اور جس سے اعتقاد کا لیڈر یا کارکن چننے اور پرکھنے کا معیار بنتا ہے آئندہ اوراق میں ملاحظہ کیجئے

اشتراکیت اور اسلام

(۲)

(از جناب محمد مظہر الدین صاحب صدیقی بی۔ اے)

اشتراکی تحریک کی مختصر تاریخ!

یورپ میں اشتراکیت کی ابتداء ایک جامع اور منظم تحریک کی حیثیت سے ہوئی جب ۱۸۴۸ء میں مارکس اور انجلس نے مل کر وہ مشہور اعلان مرتب کیا جسے اشتمالی منشور (Communist Manifesto) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس سے قبل فرانس میں سینٹ سائمن (Saint Saimon) اور فوریر (Fourier) جیسے مفکرین اشتراکی عقائد کی تبلیغ کر رہے تھے۔ اگرچہ ان کا کام زیادہ تر نظری تھا اور اس کا دائرہ اثر بھی بہت محدود تھا۔ انگلستان میں رابرٹ اوین (Robert Owen) نے سب سے پہلے اشتراکی خیالات کو عمل کا جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ اوین خود سرمایہ داروں کے طبقہ سے تعلق رکھتا تھا لیکن اسے مزدوروں کے ساتھ بڑی ہمدردی تھی۔ اس نے چند اور سرمایہ داروں کے ساتھ مل کر گلاسگو شہر کے نزدیک نیو لینارک (New Lanark) کی بستی میں ایک کارخانہ خریدا اور اس میں مزدوروں کی حالت درست کرنے کا کام شروع کیا۔ اس نے تمام مزدوروں کو ایک جگہ آباد کیا۔ اتحادی دکانیں کھولیں جن سے وہ اپنی ضروریات کے لئے سامان خرید سکتے تھے۔ اس نے مزدوروں کی تعلیم کا بھی انتظام کیا اور ان کے کام کے اوقات دیگر کارخانوں کے مقابلہ میں بہت کم کر دیئے۔

یہ تجربہ نہایت کامیاب ثابت ہوا اور اوین کی سرپرستی میں لینارک کے مزدوروں کی حالت بہت سدھر گئی لیکن بعض اختلافات کی وجہ سے اسے یہ کام چھوڑنا پڑا۔ اس نے اس قسم کے دو چار تجربے اور بھی کئے اور کسی حد تک اس میں کامیاب بھی ہوا۔ لیکن اوین کے کام کا دائرہ بہت محدود تھا اور اس میں بھی اسے بڑی مخالفتوں کا

سامنا کرنا پڑا۔

اس دور کے اشتراکیوں میں لوئیس بلانک (Louis Blanc) بہت ممتاز تھا۔ اس نے ۱۸۴۸ء میں فرانس کے اس جمہوری انقلاب میں بڑا حصہ لیا جس کے نتیجہ کے طور پر لوئیس فلپ (Louis Phillips) کو فرانس کا تخت چھوڑنا پڑا۔ فوریر اور سینٹ سائمن کے برعکس جن کا دائرہ کار بہت محدود تھا۔ لوئیس بلانک نے جمہور پر اپنے خیالات کا گہرا اثر ڈالا۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ مزدوروں کیلئے کام فراہم کرنا حکومت کا ایک ضروری فریضہ ہے چنانچہ لوئیس فلپ کے اخراج کے بعد جو عارضی حکومت قایم ہوئی اور جس میں لوئیس بلانک بھی شریک تھا اس نے قومی کارخانے قایم کئے جن میں مزدوروں کے لئے کام فراہم کیا جاتا تھا اور اس کام کا انہیں مقررہ معاوضہ دیا جاتا تھا۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے عرصہ میں ہی قومی کارخانوں میں کام کرنے کے لئے ایک لاکھ پندرہ ہزار اشخاص کی درخواستیں جمع ہوگئیں۔ اتنی بڑی تعداد کے لئے کام دینا دشوار تھا۔ بالآخر حکومت نے اس کوشش کو خیرباد کہا اور لوئیس بلانک کی کوششیں رائگاں گیئں

۱۸۶۴ء میں کارل مارکس کی رہنمائی میں مزدوروں کی پہلی بین الاقوامی مجلس قایم ہوئی جسے فرسٹ انٹرنیشنل کہا جاتا ہے۔ فرسٹ انٹرنیشنل یا پہلی بین الاقوامی مجلس کے تحت یورپ کے مختلف ممالک میں اشتراکی تحریک کی تنظیم کا کام شروع کیا گیا۔ چنانچہ جرمنی کی مشہور معاشرتی جمہوری (Social Democratic) پارٹی اس زمانہ میں وجود میں آئی لیکن جرمنی میں اس پارٹی کے خلاف ایک اور طاقتور پارٹی قایم تھی جس کا رہنما لیسال (Lassale) تھا۔

لیسال اور کارل مارکس کے خیالات میں بڑا اختلاف رائے تھا جس کے نتائج بعد میں ظاہر ہوئے لیسال تدریجی اصلاح کا قائل تھا اور اس کا خیال تھا کہ اشتراکیت کے لئے موجودہ طرز جمہوری حکومتوں کو قایم رکھنا ضروری ہے۔ البتہ ان جمہوری حکومتوں کو صنعت و حرفت اور تجارت میں بیش از بیش مداخلت کرنی چاہیئے اور قانون سازی کے ذریعہ صنعتی نظام کو سرمایہ داروں کی گرفت سے نکال کر اپنے قبضہ میں لینا

چاہیئے۔ اس کے برعکس کارل مارکس موجود الوقت جمہوری حکومتوں کے ذریعہ اصلاح کی کوشش کو بیکار سمجھتا تھا وہ اصلاح کا نہیں بلکہ انقلاب کا قائل تھا۔ وہ کہتا تھا کہ جمہوری مملکت نظام سرمایہ داری کی وسعت پذیر ضروریات کو پورا کرنے کیلئے وجود میں آئی ہے اور سرمایہ داروں کے مفاد کی حمایت اس قسم کی حکومت کا ضروری خاصہ ہے اس کو قبول کرکے اور اس کے اندر رہ کر اصلاح کی کوشش کرنا محض تضیع اوقات ہے۔

۱۸۷۵ء میں گوتھا کانگریس (Gotha Congress) کے موقعہ پر جب جرمنی کی معاشرتی جمہوری پارٹی نے لیسال کی قائم کی ہوئی پارٹی سے مصالحت کرلی اور اس کے ساتھ شریک ہوکر کام کرنے کا فیصلہ کیا تو مارکس نے اس فیصلہ پر بہت ناراضی کا اظہار کیا اور گوتھا پروگرام پر اس نے جو تبصرہ لکھا اس میں جمہوری معاشری پارٹی کی ارتقائی اشتراکیوں سے مصالحت کو مذموم ٹھہرایا، کیونکہ مارکس کے خیال میں ان لوگوں کا ساتھ دینا جو جمہوری نظام کو قائم رکھ کر تدریجی اصلاح کے ذریعہ اشتراکیت قائم کرنا چاہتے ہیں، درحقیقت اشتراکیت کے قیام پر ایک کاری ضرب لگانا ہے۔

فرسٹ انٹرنیشنل کے تحت فرانس میں بھی اشتراکی تحریک کو منظم کرنے میں مارکس کے پیروؤں کو مخالفت زیادہ تر پرودھان (Proudhen) اور بلانکی کے حامیوں کی طرف سے عمل میں آئی پرودھان نراج کا حامی تھا اور بلانکی کے خیالات اور مارکس کے نظریات میں خاص فرق یہ تھا کہ بلانکی انقلاب برپا کرنے کیلئے عام مزدوروں میں طبقاتی شعور کی ضرورت کا قائل نہ تھا اس کا خیال تھا کہ اگر مزدوروں میں انقلاب کی خواہش نہ بھی ہو۔ تب بھی ایک مختصر مگر قوی جماعت انقلاب پیدا کرسکتی ہے اس کے برخلاف مارکس کی رائے یہ تھی کہ انقلاب اس صورت میں کامیاب ہوسکتا ہے جب جمہور اور عام مزدوروں کے اندر سرمایہ داروں کے مقابلہ میں طبقاتی بیگانگت کا شعور پیدا ہوجائے اور وہ انقلاب کو اپنی فلاح کے لئے ضروری خیال کرنے لگیں۔

فرسٹ انٹرنیشنل کے انتہائی عروج کا زمانہ وہ تھا جب پرشیا والوں نے نپولین سوم کو سیڈان (Sedan) پر شکست دی اور فرانس میں جمہوری انقلاب برپا ہوا۔ اس کے بعد فرسٹ انٹرنیشنل

کا زور کم ہو گیا۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں مزدوروں کی دوسری بین الاقوامی مجلس یعنی سیکنڈ انٹرنیشنل قائم ہوئی اور اس میں تمام ممالک کے مزدور نمائندوں نے حصہ لیا۔ اس زمانہ میں روس کے اشتراکیوں پر بہت مظالم ڈھائے جا رہے تھے اور ان کے اکثر رہنما ملک سے باہر جلاوطن کر دیئے گئے تھے۔ اس لئے روسی اشتراکیوں کو اپنی تحریک روس سے باہر رہ کر چلانی پڑتی تھی۔

روس میں اس وقت تین پارٹیاں تھیں: معاشرتی انقلابی پارٹی Social Revolutionary Party، تعداد میں سب سے زیادہ تھی۔ اس کے ارکان زیادہ تر روس کے کسان تھے لیکن چونکہ کسان ملک میں دور دور منتشر تھے! اس لئے اس پارٹی میں تنظیم کی کمی تھی۔ دوسری پارٹی بالشویکوں کی تھی جو بڑے بڑے شہروں کے مزدوروں پر مشتمل تھی اور اس لئے تنظیم اور مرکزیت کے اعتبار سے بہت زیادہ قوی تھی۔ تیسری پارٹی منشویکوں کی تھی۔ یہ لوگ بھی اپنے کو کارل مارکس کا پیرو کہتے تھے لیکن ان میں انقلابی سپرٹ بہت کم تھی۔ درحقیقت یہ پارٹی جرمنی کی معاشرتی جمہوری پارٹی کی ہم مسلک تھی اور موجود الوقت جمہوری نظام کے اندر رہ کر تدریجی اصلاح کا کام کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے حقیقتاً اس پارٹی کو مارکس کے خیالات سے کوئی تعلق نہ تھا:

روسی انقلاب ہم بتا چکے ہیں کہ جنگ عظیم سے قبل روس میں تین اشتراکی پارٹیاں قائم تھیں۔ یہ تینوں پارٹیاں روسی شہنشاہیت سے بیزار تھیں اور ملک میں ایک ایسا نظام قائم کرنا چاہتی تھیں جس میں عوام الناس، مزدوروں اور کسانوں کی حالت سدھاری جا سکے۔ اس زمانہ کی روسی شہنشاہیت سرمایہ داروں کے مفاد کی حامی اور عوام کے معاشی مصائب سے بے پروا تھی۔

روس میں نظام سرمایہ داری یورپ کے دوسرے ممالک کی بہ نسبت بہت دیر میں قائم ہوا اور اس کی بنیاد بہت غیر مستحکم تھی۔ بلکہ حقیقت میں جنگ عظیم تک روس میں نظام سرمایہ داری پورے طور پر قائم ہی نہ ہوا تھا۔ اس دور کا روسی نظام سرمایہ داری اور جاگیرداری کا ایک نامربوط مجموعہ تھا۔ روس کی

زیادہ تر آبادی کسانوں پر مشتمل تھی جو دور دور پھیلے ہوئے تھے۔ مزدوروں کی تعداد بہت کم تھی کیونکہ صنعتی کارخانے صرف چند بڑے شہروں تک محدود تھے۔ سرمایہ داری نظام کے مظاہر خصوصیات سے روس بڑی حد تک نا آشنا تھا متوسط طبقہ تعداد کے لحاظ سے نہ ہونے کے برابر تھا۔ ملک میں یا تو غریب مفلوک الحال کسان بستے تھے یا بڑے بڑے زمیندار اور سرمایہ دار تھے حالانکہ انگلستان اور فرانس اور دوسرے یورپی ممالک میں جہاں سرمایہ داری ترقی پذیر تھی متوسط طبقہ خوشحال، کثیر التعداد و باثر تھا۔

۱۹۱۷ء تک روسی آبادی جنگ سے بیزار ہو چکی تھی۔ متواتر شکستوں نے ملک میں ہر طرف بدامنی اور انتشار پیدا کر دیا تھا۔ مارچ ۱۹۱۷ء میں روس میں اچانک انقلاب برپا ہو گیا۔ یہ انقلاب اتنی سرعت کے ساتھ اور ایسے غیر متوقع طور پر ہوا کہ خود انقلابی اس کے لئے تیار نہ تھے ۸ مارچ ۱۹۱۷ء کو پیٹروگراڈ کے کارخانوں کی مزدور عورتوں نے ہڑتال کر دی اس کے بعد یہ شورش بڑھتی گئی اور پھیلنے لگی یہاں تک کہ ۱۵ مارچ کو زار نکولاس دوم تخت سے دستبردار ہو گیا اور کیرنسکی (Kerensky) کے تحت ایک عارضی حکومت قائم ہو گئی۔

یہ عارضی حکومت اعتدال پسند اشتراکیوں پر مشتمل تھی۔ ادھر ملک کا یہ حال تھا کہ ہر طرف سے صلح کا مطالبہ ہو رہا تھا۔ سپاہی، مزدور، کسان سب کے سب جنگ کی سختیوں اور مصیبتوں سے تنگ آ گئے تھے۔ اس پر بھی کیرنسکی کی حکومت نے جرمنی سے صلح کرنے کی کوشش نہ کی بلکہ متحدین کے اصرار پر جرمن فوجوں پر نیا حملہ شروع کر دیا۔ یہ حملہ بالکل ناکام رہا اور اب ہر طرف ملک میں بغاوت پھیل گئی۔

بالشویکوں نے ان حالات سے فائدہ اٹھا کر بڑی دانشمندی سے ملک میں یہ پروپیگنڈا کیا کہ اگر حکومت ان کے ہاتھ آ جائے تو وہ فوراً جرمنی سے صلح کر لیں گے علاوہ ازیں انہوں نے کسانوں سے بھی وعدہ کیا کہ اگر انقلاب برپا کرنے میں وہ ان کا ساتھ دیں تو حکومت ملنے پر بڑے بڑے زمینداروں سے ان کی زمینیں چھین کر کسانوں میں تقسیم کر دی جائیں گی۔ کاشتکاروں اور کسانوں کے لئے اس سے بڑھ کر کیا ترغیب ہو سکتی تھی کہ وہ زمینوں

کے مالک بن جائیں اور جنگ کی مصیبتوں سے چھٹکارا پائیں غرضیکہ اپنے پروپیگنڈے میں بالشویکوں کو بڑی کامیابی ہوئی اور اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ ملک کے عام مطالبہ صلح کی خواہش کو پورا کرنے پر تیار تھے بالآخر اکتوبر ۱۹۱۷ء کو کیرنسکی کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا اور بالشویکوں کا راج قایم ہوگیا۔

اقتدار ملتے ہی بالشویکوں نے جرمنی کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھایا اور ۱۹۱۸ء میں بریسٹ لٹویسک کے مقام پر صلح ہوگئی۔ بالشویکوں کا بڑا لیڈر لینن تھا جس نے کیرنسکی کی اعتدال پسند اشتراکی حکومت کا تختہ الٹ کر مزدوروں کی آمریت قایم کی۔ کیرنسکی کی عارضی حکومت جمہوری تھی اور متوسط طبقہ کی تائید اور حمایت سے قایم ہوئی تھی۔ اس لئے وہ متوسط طبقہ کے خیالات اور ارادوں کی حامل تھی، اس کے برعکس لینن نے مزدوروں کی جو آمریت قائم کی وہ متوسط طبقوں کی دشمن اور جمہوری نظام کی سخت مخالف تھی۔ اس بارے میں لینن اور جرمنی کی معاشرتی جمہوری پارٹی کے ایک ممتاز نمائندہ کارل کاٹسکی (Karl Kautsky) کے درمیان بہت تلخ اور گرم بحث ہوئی۔ کارل کاٹسکی کی یہ رائے تھی کہ اشتراکی فلسفہ کی رو سے دنیا کو صرف جمہوری حکومت کے قیام پر اکتفا کرنا چاہئے تھا اور مزدوروں کی آمریت اس نوبت پر قایم نہ کرنی چاہئے تھی۔ کیونکہ مارکس کے نظریات کے مطابق مزدوروں کی آمریت اسی حالت میں قایم ہوسکتی ہے جب انتظام سرمایہ داری کا نشوونما خوب اچھی طرح ہوچکا ہو۔

مارکس کا خیال تھا کہ کوئی نظام اس وقت تک نہیں مٹایا جاسکتا جب تک عروج و ترقی کا ایک دور گزرنے کے بعد اس پر زوال طاری نہ ہوجائے۔ یہ صورت صرف انگلستان اور فرانس جیسے ممالک میں پیش آسکتی تھی جہاں نظام سرمایہ داری عروج کی منزلیں طے کرچکا تھا۔ نہ کہ روس میں جہاں اس کا قیام ہی ابھی پوری طرح عمل میں نہ آیا تھا۔ لینن کا دعویٰ یہ تھا کہ معاشی ارتقا کے جو مراتب مارکس نے معین کئے تھے روسی انقلاب ان پر پوری طرح ٹھیک اترتا ہے۔

بہرحال لینن کو عملی طور پر اشتراکی نظام کے قیام میں کامیابی ہوئی۔ لیکن یہ یاد رہے کہ خود لینن کی رائے

میں انقلاب کے بعد کا روسی نظام صحیح معنوں میں اشتراکی نہ تھا کیونکہ اشتراکیت اسی وقت قائم ہو سکتی ہے جب مملکت کا وجود فنا ہو جائے اور ابھی اس کی منزل بہت دور ہے۔ لینن کی رائے تھی کہ روس کے جدید نظام کو ریاستی سرمایہ داری (State Capitalism) سے موسوم کرنا زیادہ صحیح ہوگا۔ اس طرح خود لینن کے کہنے کے مطابق روسی اشتراکیت سرمایہ داری کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے اور اشتراکیت کا قیام ابھی بہت دور ہے۔

روسی اشتراکیوں نے حکومت پر قبضہ کرنے کے بعد ایک کام یہ کیا کہ مزدوروں کی تیسری بین الاقوامی مجلس یعنی تھرڈ انٹرنیشنل کے قیام کا اعلان کیا جو سیکنڈ انٹرنیشنل کا جانشین تھا۔ اس کا مقصد یہ بتانا تھا کہ روسی انقلاب درحقیقت اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے جسے مارکس نے مزدوروں کی پہلی بین الاقوامی مجلس یا فرسٹ انٹرنیشنل قائم کرکے شروع کیا تھا۔

اشتراکی نظریات پر ایک تنقیدی نگاہ مارکس اور اینجلس کے مرتب کردہ اشتمالی منشور کا آغاز اس بلند بانگ دعوی سے ہوتا ہے "انسان نے اس وقت تک جتنے معاشرے قائم کئے ہیں ان سب کی تاریخ طبقاتی نزاع کی تاریخ ہے غلام اور آقا، امراء اور جمہور، سرمایہ دار اور مزدور، مختصر یہ کہ ظالم و مظلوم ہمیشہ ایک دوسرے کے مخالف اور باہم برسرپیکار رہے ہیں۔"

یہ دعوی منجملہ ان دعووں کے ہے جن سے اشتراکی لٹریچر بھرا پڑا ہے، لیکن جن کے ثبوت میں کوئی تسلی بخش دلیل آج تک نہیں پیش کی جاسکی۔ اشتراکیوں کے تمام فلاسفہ اور مفکرین کا ابتداء سے یہ شیوہ رہا ہے۔ کہ وہ تاریخی واقعات میں صرف اپنے مفید مطلب باتیں چھانٹ لیتے ہیں اور جتنے واقعات ان کے نظریہ کے خلاف پڑتے ہیں انہیں یا تو بالکل نظرانداز کر دیتے ہیں یا ان کی غلط تاویل کرنے لگتے ہیں۔

کوئی شخص جس نے تاریخ پر غیر جانبدارانہ اور گہری نظر ڈالی ہو کبھی اس دعوے کو تسلیم نہیں کر سکتا ہے کہ انسانی معاشرہ کی تاریخ صرف طبقاتی جنگ کی تاریخ ہے۔ یہ بات درست ہے کہ طبقاتی نزاعوں نے بھی واقعات اور حالات کی تشکیل پر گہرا اثر ڈالا ہے لیکن یہ دعوی بالکل مہمل ہے کہ طبقاتی نزاع سے ہی انسان کی پوری تاریخ

بنی ہے قومی لڑائیوں اور جھگڑوں نے تاریخ پر طبقاتی جنگوں سے کہیں زیادہ گہرا اثر مرتب کیا ہے۔ سکندر، ہنیبال، ہلاکو خاں، چنگیز خاں، صلاح الدین ایوبی، اور بایزید نے جتنی جنگیں لڑیں وہ طبقاتی جنگیں نہ تھیں لیکن ان کے نتائج و اثرات آج تک باقی ہیں۔ البتہ اس کا کوئی علاج نہیں ہے کہ قومی جنگوں کا سرا بھی طبقاتی لڑائیوں سے لا کر ملا دیا جائے۔ یرقان کے مریض کو دنیا کی تمام چیزیں زرد نظر آتی ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ واقعتاً زرد ہیں۔

ساری تاریخ اس دعوے کو جھٹلاتی ہے کہ امرأ اور جمہور، غلام اور آقا، مزدور اور سرمایہ دار ہمیشہ ایک دوسرے سے بر سر پیکار رہے ہیں۔ تاریخ میں جتنی قومی اور مذہبی لڑائیاں ہوئیں، ان سب میں امرأ اور جمہور، غلام اور آقا، مزدور اور سرمایہ دار نے آپس میں مل کر اپنے حریفوں کا مقابلہ کیا اور باہمی اختلافات کو قومی و مذہبی عزت پر قربان کر دیا۔

روما کے وہ کون شہری تھے جنہوں نے پہلے لاطینی لڑائیوں اور پھر قرطاجنہ (Carthage) کے مقابلہ میں داد شجاعت دی؟ کیا وہ روما کے عوام (Plebians) نہیں تھے جنہوں نے اشراف (Patricians) سے مل کر بیرونی دشمن کا مقابلہ کیا؟ عرب کی وہ افواج کن افراد پر مشتمل تھیں، جنہوں نے صحرا سے نکل کر قیصر و کسریٰ کی سلطنت کو الٹ دیا؟ کیا ان میں قریشی، انصاری، یمنی اور دیگر قبائل کے امیر و غریب یکساں شریک نہ تھے؟ جنگ عظیم میں انگلستان، فرانس اور جرمنی کے مزدوروں نے کس کا ساتھ دیا؟ اشتراکیت کے لاطائل پروپیگنڈے کے باوجود گذشتہ جنگ میں ہر ملک کے مزدوروں نے اس کے جملہ دیگر طبقوں کے ساتھ مل کر اپنی قوم کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دی۔ اور کیا موجودہ جنگ میں مزدوروں کا عمل اس سے مختلف ہے؟ کیا اس وقت جرمنی کے مزدور اپنی قوم کے لئے، انگلستان کے مزدور اپنے ملک کیلئے، اور امریکہ کے مزدور اپنی جمہوریت کیلئے خون پسینہ ایک نہیں کر رہے ہیں؟ ان واقعات سے آنکھیں پھیر لینا، صرف اپنے مفید مطلب واقعات کو استدلال میں پیش کرنا اور پھر یہ دعویٰ کرنا کہ

ساری تاریخ طبقاتی شعور و احساس کی ایک داستان مسلسل ہے۔ صرف انہیں لوگوں کا کام ہے جو جذبات کے ہیجان میں نظر کا توازن قائم نہیں رکھ سکتے۔

تاریخ کے سیاسی و مذہبی انقلابات کے متعلق اشتراکیوں کا دعویٰ ہے کہ یہ تمام انقلابات درحقیقت معاشی اسباب و محرکات سے ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ نیز انسان کے تمام اخلاقی تصورات، مذہبی افکار اور سیاسی نظریات ان معاشی قوتوں سے ضمناً پیدا ہوئے ہیں جو تاریخی انقلابات کو وجود میں لاتی ہیں۔ اب اگر اشتراکی حضرات سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ وہ کیا معاشی اسباب و محرکات تھے جنہوں نے چھٹی[6] صدی عیسوی میں عرب کے اندر ایک مذہبی انقلاب پیدا کر کے انہیں وحشت و جہالت کی زندگی سے نکالا اور وقت کی عظیم ترین انقلابی اور تہذیبی قوت بنا دیا، تو فوراً جواب ملتا ہے کہ عربوں کا افلاس، ان کی معاشی بدحالی اور اقتصادی پستی اس انقلاب کا باعث تھی کیونکہ انہیں باتوں نے عربوں کو مجبور کیا کہ وہ دوسرے ملکوں کو فتح کر کے اپنے لئے سامان زندگی مہیا کریں۔

اگر یہ دلیل صحیح مان لی جائے تو پھر یہ بات مطلق سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ اشتراکیت کا پرچار کیوں کیا جائے اور معاشی مصائب یا اقتصادی پستی کو دور کرنے کی کیوں کوشش کی جائے کیونکہ اس دلیل کی بنا پر معاشی بدحالی اور اقتصادی مشکلات کو دنیا کی سب سے بڑی تہذیبی قوت تسلیم کرنا ہوگا۔ اگر عربوں کا افلاس ان کی فاقہ کشی اور ان کے معاشی مصائب ہی ان کی تمام اولوالعزمیوں، فتح مندیوں اور اصلاحی کوششوں کا باعث تھے تو پھر ماننا پڑے گا کہ دنیا میں معاشی زبوں حالی اور افلاس و تنگی سے زیادہ مبارک اور خوش انجام کوئی اور حالت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس نے چھٹی صدی عیسوی میں وہ انقلاب عظیم پیدا کیا جس کے نتیجہ میں مغربی ایشیا کی مظلوم قوموں کو ان کے ظالم حکمرانوں سے رہائی ملی اور عربوں کے اندر وہ سائنٹفک اسپرٹ پیدا ہوئی جس کے اثرات نے یورپ کو وحشت و بربریت سے نکال کر ترقی کے راستہ پر گامزن کیا۔ محض معاشی پستی اور افلاس سے اگر یہ اعلیٰ نتائج حاصل ہو سکتے ہیں تو اسے مٹانے اور فنا کرنے کے بجائے اس کا قائم رکھنا زندگی کی اہم ترین

ضرورت ہے تاریخ پر ایک آنکھ سے نگاہ ڈالنا اور اس میں سے صرف من مانی باتوں کو چن لینا اسی قسم کی تضاد بیانی کا موجب ہوا کرتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ عربوں کی فتوحات اور ان کے انقلاب آفریں اقدامات میں جہاں معاشی اثرات ذخیل تھے وہیں دوسرے زیادہ طاقتور عناصر بھی کام کر رہے تھے۔ اگر اسلامی تحریک نے عربوں کو ایک نصب العین اور ایک مقصد پر متحد نہ کر دیا ہوتا اور انہیں ایک عالمگیر تخیل سے روشناس نہ کیا ہوتا تو محض معاشی اسباب کی بناء پر عربوں سے وہ نتائج ظہور میں نہ آتے جن کے لئے آج بھی دنیا ان کی زیر بار احسان ہے۔

پھر اشتراکی یہ بھی نہیں بتاتے کہ پیغمبر اسلام کے ظہور کے وقت عربوں کے معاشی نظام میں کیا تغیرات واقع ہو رہے تھے اور طریق پیداوار کی وہ کونسی تبدیلیاں تھیں جنہوں نے اس خلاقی اور مذہبی انقلاب کا روپ بھرا؟ اور نہ وہ اس سوال کا کوئی جواب دے سکتے ہیں کہ یہ اسلامی تحریک کس نئے طبقہ کو میدان میں لائی اور اس نے کن قدیم طبقوں کو مٹایا؟ ہم بتا چکے ہیں کہ اشتراکی فلسفہ کی رو سے طریق پیداوار کی تبدیلیاں اور معاشی نظام کے انقلاب بالجبر تقاضے ہی دنیا کے بڑے بڑے سیاسی و مذہبی انقلابات کا باعث ہوتے ہیں، اس فلسفہ کی روشنی میں اوپر کے سوالات کا اطمینان بخش جواب دینا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ سب سے اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مذہبی انقلاب کس نئے معاشی نظام کو وجود میں لایا؟ غلامی کا نظام تو عربوں میں پہلے ہی موجود تھا۔ اشتراکیت کے بنائے ہوئے سلسلہ ارتقاء کے لحاظ سے تو اس انقلاب کے بعد جاگیرداری نظام کو ان ملکوں سے بھی مٹا دینا۔ جہاں وہ قائم تھا، پھر کیا اسلام نظام سرمایہ داری کے قیام کا باعث ہوا؟ یا وہ اشتراکی نظام کے لئے راستہ صاف کرنے آیا تھا؟

بعض اشتراکی حضرات آخری تاویل کو قبول کرتے ہیں یعنی اسلامی نظام اشتراکیت کا پیش خیمہ تھا، لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ معاشی ارتقاء کے درمیانی مدارج بیچ سے غائب ہی ہو جائیں اور اچانک ارتقا کی آخری منزل کا پیش خیمہ نمودار ہو جائے۔

رسائل و مسائل

لباس اور چہرے کی شرعی وضع

"مطالبہ کیا جاتا ہے، کہ صحیح معنوں میں مسلمان بننے کے لئے آدمی کو لباس اور چہرے کی اسلامی وضع قطع اختیار کرنی چاہئے۔ براہ کرم بتائیے، کہ اس سلسلے میں اسلام نے کیا احکام دئے ہیں؟"

لباس اور چہرہ کی وضع قطع کے متعلق آپ نے جو سوال کیا ہے، اس کا جواب تو میں دئے دیتا ہوں، لیکن اس سے پہلے آپ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ ظاہر کی اصلاح باطن کی اصلاح پر مقدم نہ ہونی چاہئے۔ سب سے پہلے اپنے آپ کو قرآنی معیار کے مطابق حقیقی مسلمان بنانے کی کوشش کیجیے، پھر ظاہر کی تبدیلی اس حد تک کرتے چلے جائیے جس حد تک باطن میں واقعی تبدیلی ہوتی جائے۔ ورنہ مجرد ضابطہ و قانون (RULES & REGULATIONS) کو سامنے رکھ کر اگر آپ نے اپنے ظاہر کو اُس نقشہ پر ڈھال لیا۔ جو حدیث و فقہ کی کتابوں میں ایک متقی انسان کے ظاہری نقشہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، اور اندر حقیقی تقویٰ پیدا نہ ہوا، تو آپ کی مثال ایسی ہوگی جیسے تانبے کے سکہ پر اشرفی کا ٹھپہ لگا ہوا ہو۔ اشرفی کا ٹھپہ لگانا کوئی بڑا مشکل کام نہیں ہے۔ بہت آسانی سے جس سستی سے سستی دھات پر چاہیں اس کو لگا سکتے ہیں، لیکن زرِ خالص بہم پہنچانا ایک مشکل کام ہے، اور بہت مدت کی کیمیا گری سے یہ چیز حاصل ہوا کرتی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں ایک مدت سے ظاہر پر غیر معمولی زور دیا جا رہا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اشرفی کے ٹھپے کے ساتھ تانبے، لوہے، سیسے، اور ہر قسم کی گھٹیا دھاتوں کے سکے چل پڑے ہیں۔ عملی دنیا کا بازار ایسا بے لاگ صراف ہے کہ وہ زیادہ مدت تک اس جعل سازی سے دھوکا نہیں کھا سکتا۔ کچھ مدت تک تو ہماری دھوکے کی اشرفیاں چل گئیں، لیکن اب بازار میں کوڑی بھر بھی ان کی قیمت باقی نہیں رہی ہے۔ پس ہمیں اپنی جماعت میں جس قسم کی دینداری پیدا کرنی ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اشرفی کا ٹھپہ لگانے سے پہلے سونے کا سکہ بننے کی کوشش کریں۔

لباس اور چہرے کی وضع اور ایسے ہی دوسرے ظواہر کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنی ہدایات دی ہیں، وہ مدینہ طیبہ کے آخری پانچ چھ برسوں کی ہیں۔ اس سے پہلے پندرہ سولہ سال تک آپ اپنے متبعین میں تقویٰ اور احسان کی وہ صفات پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے جن کا مفصل نقشہ قرآن مجید اور احادیث نبوی میں بیان ہوا ہے۔ اس ترتیب پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے جس کو تزکیۂ نفوس کی خدمت پر مقرر فرمایا تھا۔ اس نے بھی پہلے اپنی پوری توجہ مس خام کو کندن بنانے ہی پر صرف کی تھی، پھر جب کندن بنا لیا تب اس پر اشرفی کا نقش مرتسم کیا۔ لیکن اس تقدیم و تاخیر کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسے احکام شرعی کی تعمیل سے جی چرانے کا بہانہ بنایا جائے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی متقیانہ وضع بنانے سے پرہیز کیا جائے جس کی تہ میں واقعی تقویٰ اور خدا ترسی موجود نہ ہو اور جس کے اندر اسلامی اخلاق کی روح مفقود ہو۔

لباس کے متعلق اسلام نے جس پالیسی کا تعین کر دیا ہے وہ یہ ہے کہ آپ ایسی وضع میں رہیں جس میں آپ کو دیکھ کر ہر شخص معلوم کر سکے کہ آپ مسلمان ہیں۔ بحیثیت مجموعی آپ کی وضع قطع کفار سے مشابہ نہ ہونی چاہیے۔

ڈاڑھی کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی مقدار مقرر نہیں کی ہے، صرف یہ ہدایت فرمائی ہے کہ رکھی جائے۔ آپ اگر ڈاڑھی رکھنے میں فاسقین کی وضعوں سے پرہیز کریں اور اتنی ڈاڑھی رکھ لیں جس پر عرف عام میں ڈاڑھی رکھنے کا اطلاق ہوتا ہو (جسے دیکھ کر کوئی شخص اس شبہ میں مبتلا نہ ہو کہ شاید چند روز سے آپ نے ڈاڑھی نہیں مونڈی ہے) تو شارع کا منشا پورا ہو جاتا ہے خواہ اہل فقہ کی استنباطی شرائط پر وہ پوری اترے یا نہ اترے۔

سر کے بالوں کے متعلق صرف یہ ہدایت ہے کہ کچھ مونڈنا اور کچھ رکھنا ممنوع ہے۔ موجودہ زمانہ میں جس قسم کے بالوں کو پنجاب میں "بودے" کہتے ہیں، اور جنہیں یو۔پی میں انگریزی بال کہا جاتا ہے۔ ان کے ناجائز ہونے کی مجھے کوئی دلیل نہیں ملی۔ لیکن ایک غیر مسلم قوم کی ایجاد کردہ وضع کو سر چڑھانے میں کراہت کا پہلو ضرور ہے اور اسی لئے میں نے اس وضع کو بدل دیا ہے۔

ڈاڑھی کے متعلق ایک سوال

"میں نے ڈاڑھی رکھ لی ہے۔ میرے کچھ ایسے رشتہ دار جو علم دین سے کافی واقف ہیں، وہ اس پر اعتراض کرتے

ہیں کہ ڈاڑھی فرض نہیں ہے، قرآن میں اس کے متعلق کوئی حکم نہیں ملتا، ڈاڑھی نہ رکھی جائے تو کوئی گناہ کبیرہ ہے، یہ رسول کی سستی محبت ہے۔ آپ فرمائیے کہ میں انہیں کیا جواب دوں؟"

ڈاڑھی کے متعلق آپ نے جو سوال مجھ سے کیا ہے۔ اس پر ایک انگریز نومسلم کا واقعہ یاد آگیا جس نے اسلام کا اچھا مطالعہ کرنے کے بعد اس کو قبول کیا تھا۔ قبولِ اسلام کے بعد ہی اس نے ڈاڑھی مونڈنی چھوڑ دی۔ بعض لوگ جو اسی طرح کے "علم دین" سے کافی واقف تھے جیسے آپ کے یہ عزیز ہیں، کہنے لگے کہ ڈاڑھی رکھنا اسلام میں کچھ ایسا ضروری کام تو نہیں ہے، پھر کیوں خواہ مخواہ آپ نے ڈاڑھی مونڈنی چھوڑ دی؟ اس نے جواب دیا "میں ضروری اور غیر ضروری کی تقسیم کو نہیں جانتا، میں بس یہ جانتا ہوں کہ پیغمبر نے اس کا حکم دیا ہے، جب میں نے پیغمبر کی اطاعت قبول کرلی تو حکم بجالانا میرا فرض ہے کسی ماتحت کا یہ کام نہیں ہے کہ (HIGHER AUTHORITY) افسر بالا کے احکام میں سے کسی کو ضروری اور کسی کو غیر ضروری قرار دے"۔ بس یہی واقعہ اپنے ان عزیزوں کو سنا دیجئے۔ اور ان سے یہ بھی پوچھئے کہ یہ تو خیر رسول کی سستی محبت ہے، جناب نے اگر کسی مہنگی محبت کا ثبوت دیا ہو، تو ارشاد فرمایئے۔ اگر ایک نوکر آقا کے آسان احکام کی تعمیل سے بھی گریز کرتا ہے۔ تو وہ امور مہمّہ کو کیسے سرانجام دے سکیگا۔ ہم سستی اور مہنگی محبت کا فرق نہیں جانتے۔ ہمیں تو پوری طرح اس راستے پر چلنا ہے۔ جس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم چلے ہیں، اور ان احکام کی تعمیل کرنی ہے۔ جو آپ نے دیے ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک بات اور سمجھ لیجئے۔ موجودہ زمانہ میں ڈاڑھی رکھنا، کسی ایسے شخص کے لئے جو فرنگیت زدہ طبقوں سے تعلق رکھتا ہو، محض ایک حکم نبوی کی تعمیل ہی نہیں ہے، بلکہ ایک طرح کا جہاد بھی ہے اور عجب نہیں کہ اسکے ساتھ کچھ نہ کچھ ہجرت کا اجر بھی مل جائے۔ سب سے پہلے تو اس کو خود اپنے اس مذاق اور رنگ طبیعت کے خلاف بہت دنوں تک جدوجہد کرنی پڑتی ہے جو برسوں کی تعلیم و تربیت اور ماحولی اثرات کے تحت اس کے اندر راسخ ہوچکا تھا۔ پھر جب وہ اس پرانے ذوق کی بیخ کنی کرنے اور اس کی جگہ اسلامی ذوق اپنے اندر پرورش کرنے میں اس حد تک کامیاب ہوجاتا ہے کہ اس کے چہرے پر ڈاڑھی اُگ سکے تو باہر ایک دوسری کشمکش شروع ہوجاتی ہے۔ اس کا ماحول اس سے لڑنے لگتا ہے۔ کہ یہ کیسا انقلاب تیرے اندر رونما ہو رہا ہے۔ اس کے عزیز، اقارب، دوست، آشنا، سب اسے چھیڑنے لگتے ہیں۔ اسکا مذاق

اڑایا جاتا ہے، اس پر پھبتیاں کسی جاتی ہیں، شادی کے مارکیٹ میں اسکی قیمت گر جاتی ہے، ہر طرف سے تقاضے شروع ہو جاتے ہیں کہ اس دیوار کو ڈھاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان اٹھ رہی ہے۔ ان پے در پے حملوں کے مقابلہ میں وہ شخص ٹھہر نہیں سکتا، جس میں کیرکٹر کی مضبوطی نہ ہو، یا جس میں اندرونی تغیر کے مکمل ہونے سے پہلے کسی وقتی جذبے کے اثر یا کسی خارجی دباؤ سے بیرونی تغیر شروع ہو گیا ہو۔ ایسا شخص تھوڑا یا بہت مقابلہ کرنے کے بعد آخر کار اپنے ماحول سے شکست کھا جاتا ہے۔ اور بہروپیوں کی طرح پھر وہی وضع اختیار کر لیتا ہے جسے چھوڑنے کی اس نے نمائش کی تھی۔ مگر جو مضبوط کیرکٹر رکھتا ہو اور جس کا باطنی انقلاب پائدار بنیادوں پر اٹھا ہو، وہ پوری ثابت قدمی کے ساتھ اس مقابلہ میں ڈٹ جاتا ہے اور اس استقامت کے نتیجہ میں اسے دو زبردست فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے اندر موجودہ کافرانہ ماحول کے خلاف دوسرے میدانوں میں بھی کامیاب لڑائی لڑنے کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے، دوسرے یہ کہ جس مضبوط سیرت کا اس نے ثبوت دیا ہے اس کا رعب اسکے ماحول پر طاری ہو جاتا ہے اور اس کی تبلیغ و تلقین میں اتنا وزن پیدا ہو جاتا ہے کہ اپنی سوسائٹی کے دوسرے اصلاح پذیر لوگوں پر بھی وہ اثر ڈال سکے۔

اکثر لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ اس زمانہ میں منڈی ہوئی ڈاڑھی محض ایک وضع نہیں ہے بلکہ ایک کلچر اور ایک مذہب زندگی کا نمایاں ترین شعار ہے۔ اس شعار کو چھوڑنا دراصل اس کلچر اور اس مذہب زندگی کو چھوڑنے کا اعلان ہے جس کا یہ شعار ہے، اور ڈاڑھی رکھنا کم از کم موجودہ حالات میں تو عملاً اسلام کو بحیثیت کلچر اور مذہب زندگی کے اختیار کرنے کا ہم معنی ہے یہ ترک و اختیار اس وقت تک حقیقی اور پائدار نہیں ہو سکتا جب تک فی الواقع آدمی کے نفس میں مغربی کلچر اور مذہب زندگی کا اچھی طرح قلع قمع نہ ہو جائے اور اس کی جگہ اسلامی کلچر اور مذہب زندگی کی جڑیں اچھی خاصی مضبوط نہ ہو جائیں۔ لہٰذا جو لوگ محض سطحی طور پر اخلاقی دباؤ ڈال کر جدید طرز کے نوجوانوں سے ڈاڑھی رکھوانے کی کوشش کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اندرونی انقلاب چاہے ہو یا نہ ہو مگر بیرونی انقلاب سے ضابطہ کی خانہ پری فوراً کر دی جائے وہ بیچارے حقائق سے اپنی ناواقفیت کا ثبوت دیتے ہیں مگر جہاں یہ تغیر فی الحقیقت ایک گہرے اندرونی انقلاب کا نتیجہ ہو، اور اس کے متوازی متقیانہ سیرت کے دوسرے مظاہر بھی ساتھ ساتھ نمایاں ہو رہے ہوں اور ماحول کے غیر اسلامی اثرات سے لڑنے میں بھی پامردی کا ثبوت دیا جا رہا ہو، ایسی جگہ اس انقلاب کو

محض ایک معمولی چیز قرار دینا اور اس کو رسول کی سستی محبت سے تعبیر کرنا صرف انہی لوگوں کا کام ہو سکتا ہے جو رخسار و ذقن کے بالوں سے کچھ زیادہ دیکھنے کی نظر نہیں رکھتے۔

موجودہ نظام اور کسبِ معاش

"آپ کی تحریروں کو دیکھنے کے بعد میں اپنے موجودہ ذریعۂ معاش سے بیزار ہو رہا ہوں لیکن موجودہ نظامِ حکومت و تمدن کے تحت کسبِ حلال قریباً ناممکن التصور ہے۔ ملازمت، کاشتکاری، اور تجارت سب پیشوں میں حرام داخل ہو گیا ہے۔ پھر ہمارے لیے کونسا راستہ ہے؟"

آپ کا کہنا بجا ہے کہ ایک کافرانہ نظامِ تمدن و سیاست کے اندر رہتے ہوئے خالص حلال کی روٹی تقریباً محال ہے۔ مگر میں نے وسائلِ رزق کے معاملہ میں حلال و حرام کی تمیز پر اپنے مضامین میں بار بار جو زور دیا ہے، اس سے میرا مقصود یہ نہیں تھا کہ حلال ذرائع یہیں کہیں موجود ہیں، لوگ حرام ذرائع کو چھوڑ کر ان کو حاصل کرلیں۔ بلکہ اس سے میرا مقصود یہ تھا کہ حلال و حرام کی تمیز پیدا ہو جانے کے بعد ایک سچا مسلمان جب اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے گا، تب اس کو صحیح اندازہ ہو گا کہ اس کفر کے تسلط کی بدولت وہ کس طرح چاروں طرف سے گندگیوں اور نجاستوں سے گھر گیا ہے۔ پھر اگر واقعی وہ پاکیزگی کا خواہاں ہو تو اس کے اندر اس نجاست خیز نظام کو مٹانے اور بدلنے کا شدید جذبہ پیدا ہو گا، اور وہ بر آن اس نظام سے سخت نفرت و کراہت کرے گا۔

اس اصولی بات کو سمجھ لینے کے بعد عملی نقطۂ نظر سے ہمارے لئے اگر کچھ ممکن ہے تو صرف یہ کہ زیادہ حرام کو چھوڑ کر کم حرام یا ملوث بہ حرام رزق کو مجبوراً گوارا کریں۔ خالص حلال کی قید کے ساتھ زندگی کا سامان بہم پہنچانا اس نظام کے اندر رہتے ہوئے ممکن نہیں ہے۔ اب یہ آپ کے حالات پر اور آپ کی قوتوں اور صلاحیتوں پر منحصر ہے کہ عملاً کونسے ذرائع آپ اختیار کر سکتے ہیں، جن میں حرام کی آمیزش کم سے کم ہو، اور آپ موجودہ کافرانہ نظام کے بقا و استحکام میں کم سے کم مددگار بنیں۔ عملاً اس میں کامیابی کے لئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ آپ اپنے معیارِ زندگی کو بدلنے کے لئے تیار ہو

جائیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ بہت سے لوگ جن کے اندر حلال و حرام کی تمیز پیدا ہو چکی ہے، یہ شرط لگاتے ہیں کہ حلال تو ملے، مگر زندگی کا معیار وہی رہے جو حرام خوری کے زمانہ میں ہم نے اختیار کیا تھا۔ یہ شرط انہیں مجبوراً اسی حرام خوری میں مبتلا رکھتی ہے۔ حلال خوری پر آدمی قائم اسی وقت رہ سکتا ہے جب کہ وہ اس امر کا فیصلہ کر لے کہ کھانا بہرحال حلال ہے قطع نظر اس سے کہ وہ پلاؤ ہو یا چٹنی، پہننا بہرحال حلال ہے، خواہ وہ نفیس کپڑے ہوں یا ٹاٹ کا پیوند لگا ہوا گاڑھا۔

رشوت اور خیانت کو حلال سمجھنے والے

"سرکاری اہلکاروں کو جو نذرانے اور ہدیے اور تحفے ان کی طلب اور جبر و اکراہ کے بغیر کاروباری لوگ اپنی خوشی سے دیتے ہیں، انہیں ملازمت پیشہ حضرات بالعموم جائز سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ رشوت کی تعریف میں نہیں آتا۔ اس لئے یہ حلال ہونا چاہیے۔ اسی طرح سرکاری ملازموں کے تصرف میں جو سرکاری مال ہوتا ہے اسے بھی اپنی ذاتی ضرورتوں میں استعمال کرنا یہ لوگ جائز سمجھتے ہیں۔ میں اپنے حلقۂ ملاقات میں اس گروہ کے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں، مگر میری باتوں سے ان کا اطمینان نہیں ہوتا۔"

ایک شخص یا اشخاص سے دوسرے شخص یا اشخاص کی طرف مال کی ملکیت منتقل ہونے کی جائز صورتیں صرف چار ہیں۔ ایک یہ کہ ہبہ یا عطیہ ہو برضا و رغبت۔ دوسرے یہ کہ خرید و فروخت ہو، آپس کی رضامندی سے۔ تیسرے یہ کہ خدمت کا معاوضہ ہو، باہمی قرارداد سے۔ چوتھے یہ کہ میراث ہو، جو از روئے قانون ایک کو دوسرے سے پہنچے۔ ان کے ماسوا جتنی صورتیں انتقال ملکیت کی ہیں، سب حرام ہیں۔ اب دیکھنا چاہیے۔ کہ جو روپیہ ایک اہلکار کسی صاحب غرض سے لیتا ہے۔ یا جو استفادہ وہ اس مال سے کرتا ہے جو دراصل پبلک کا مال ہے اور پبلک کاموں کے لئے اس کے تصرف میں دیا جاتا ہے، اس کی حیثیت کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ خرید و فروخت اور میراث کی تعریف میں تو آتا نہیں۔ پھر کیا وہ ہبہ یا عطیہ ہے؟ اس کا فیصلہ کرنے کے لئے ایک سوال کا جواب کافی ہے۔ کیا یہ ہبہ یا عطیہ ایک اہل کار کو اس صورت میں بھی ملتا، جبکہ وہ اس منصب پر نہ ہوتا، یا پنشن پر الگ ہو چکا ہوتا؟ اگر نہیں تو یہ عطیہ یا ہبہ نہیں ہے کیونکہ یہ اس کے منصب کی

وجہ سے اس کے پاس آرہا ہے نہ کہ کسی ذاتی تعلق یا محبت یا ہمدردی کی بنا پر۔ اب کیا یہ ان خدمات کا معاوضہ ہے جو ایک اہلکار اپنے منصب کے سلسلہ میں انجام دیتا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ درحقیقت معاوضہ بھی نہیں ہے۔ معاوضہ تو صرف وہ تنخواہ اور الاؤنس ہیں، جو ملازم ہونے کی حیثیت سے آدمی کو ملتے ہیں، ان کے ماسوا جو کچھ ایک اہلکار اپنے فرائضِ منصبی ادا کرنے کے سلسلہ میں حاصل کرتا ہے۔ وہ یا تو خیانت ہے، جو پبلک فنڈز میں سے کی جاتی ہے، یا ناجائز خدمات کا معاوضہ ہے، جو شرائطِ ملازمت کے خلاف عمل کرنے کے بدلہ میں آدمی کو ملتا ہے، یا جائز خدمات کا ناجائز معاوضہ ہے کیونکہ شرائطِ ملازمت کے حدود میں رہتے ہوئے کام کرنے کا معاوضہ تو بشکلِ تنخواہ آدمی پہلے ہی لے چکا ہے، اس پر پھر مزید معاوضہ حاصل کرنا صریح طور پر حرام خوری ہے

لوگوں سے کہیئے، کہ اگر حرام کھاتے ہو، تو کم از کم اسے حرام تو سمجھو، شاید کبھی اللہ اس سے بچنے کی توفیق دیدے لیکن اگر حرام کو حلال بنا کر کھایا تو تمہارے ضمیر مردہ ہو جائیں گے کبھی حرام سے بچنے کی خواہش دل میں پیدا ہی نہ ہو سکے گی، اور جب خدا کے ہاں حساب دینے کھڑے ہوگے، تو تم کو معلوم ہو جائیگا کہ حقیقت تمہارے بدلنے سے نہیں بدل سکتی، حرام حرام ہی ہے، خواہ تم اسے حلال بنانے کی کتنی ہی کوشش کرو۔ پھر لوگوں سے کہئے کہ اگر خدا اور آخرت اور حساب اور جزا و سزا، یہ سب تمہارے نزدیک محض افسانہ ہی افسانہ ہے، تب تو حرام و حلال کی بحث فضول ہے جانوروں کی طرح جس کھیت میں ہریالی نظر آئے اس میں گھس جاؤ، اور جائز و ناجائز کی بحث کے بغیر کھاؤ، جتنا کھایا جا سکے، لیکن اگر تمہیں یقین ہے، کہ اوپر کوئی خدا بھی ہے، اور کبھی اس کے سامنے جا کر حساب بھی دینا ہے، تو ذرا اس بات پر بھی غور کر لو کہ آخر یہ حرام کی کمائی کس کے لئے کرتے ہو؟ کیا اپنے جسم و جان کی پرورش کے لئے؟ مگر یہ جسم و جان تو اس خدمت پر تمہارے احسان مند نہ ہونگے، بلکہ تمہارے خلاف خدا کے ہاں الٹا استغاثہ کریں گے۔ کہ تو نے ہمیں اس ظالم کی امانت میں دیا تھا، اور اس نے ہمیں حرام کھلا کھلا کر پرورش۔ پھر کیا بیوی بچوں کے لئے یہ کرتے ہو؟ مگر یہ بھی قیامت کے روز تمہارے دشمن ہونگے، اور تم پر الٹا الزام رکھیں گے۔ کہ یہ ظالم خود بھی بگڑا، اور ہمیں بھی بگاڑ آیا۔ پھر آخر یہ عذاب الٰہی کے خطرے میں اپنے آپ کو کس لئے ڈال رہے ہو؟ وہ

باقی صفحہ ۷۰ پر

مطبوعات

مجموعۂ مقالاتِ علمیہ | شائع کردہ مجلس ادارت حیدر آباد اکاڈیمی۔ حیدر آباد۔ دکن۔ قیمت تین روپے۔ صفحات ۱۹۲۔ کاغذ، کتابت پسندیدہ۔

حیدر آباد اکاڈیمی ہر سال ایک علمی ہفتہ مناتی ہے۔ اہل ذوق کی محفل منعقد کی جاتی ہے، اور اس میں لوگ اپنی اپنی علمی تحقیقات کے قیمتی نتائج پیش کرتے ہیں۔ اس کوشش کا مقصد یہ ہے، کہ لوگوں کو ایک طرف تازہ ترین علمی معلومات کی غذا بہم پہنچتی رہے اور دوسری طرف ان کے مذاق میں سنجیدگی پیدا ہو۔

اس قسم کے جو مجموعے مختلف اداروں کی طرف سے شائع ہوتے رہتے ہیں، ان میں ایک کتاب کی سی یک جہتی بھی پائی جاتی ہے اور رسائل کا تنوع بھی موجود ہوتا ہے۔ اور ان سے مختلف طبائع کے لوگ سیراب ہو سکتے ہیں۔ پیشِ نظر مجموعہ بھی اسی شان کا حامل ہے، اس کے مطالعہ سے کاروانِ علم کی مجموعی پیشقدمی کا اندازہ بھی ہوتا ہے اور مختلف میدانوں میں انسانی دنیا جو ذخائر معلومات فراہم کر رہی ہے، ان سے علیحدہ علیحدہ استفادہ بھی کیا جا سکتا ہے۔

اس علمی دسترخوان کو سجانے میں اساتذانِ فن بھی شریک ہیں اور نو آموز کارکن بھی، دینیات کے ماہر بھی شریک ہیں اور معاشیات کے عالم بھی۔ ریاضی اور طبیعات کے فاضل بھی ہیں اور تاریخ و تعلیم کے محقق بھی۔ بحمد اللہ کہ ان لوگوں کی تحریروں میں جدید عہد کا ملحدانہ نقطۂ نظر کار فرما نہیں ہے، لیکن دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے، کہ اکیڈیمی کے مقالہ نگار علوم کو مسلمان بنانے کیلئے ایک علمی انقلاب برپا کرنے اور ایک نئی ذہنی امامت کا علم اٹھانے کی اسپرٹ سے کام نہیں لے رہے۔ جس دن اس کام کے لئے کوئی اکیڈیمی قائم ہوگی، وہ دن اس جاہلی تہذیب کے لئے حد درجہ منحوس ہوگا۔

مسلم انڈیا | مرتبہ و مؤلفہ جناب کاشش البرنی صاحب۔ گرد پوش سے مزین جلد صفحات ۲۷۲۔ قیمت تین روپے۔

ملنے کا پتہ:۔ سٹار لائٹ پبلشنگ کمپنی ہسپتال روڈ۔ لاہور

کانگرس نے فروغ دئے ہوئے" انڈین نیشلزم" کے اژدہا نے جس متانت سے مسلم قوم کو نگل لینے کی ساحرانہ مساعی شروع کی تھیں، آخر اس کی حقیقت ہندستانی مسلمانوں پر فاش ہوگئی، اور انہوں نے "مسلم نیشلزم" کا ہتھیار مہیا کیا اور ہندو راج کے خطرے کا سد باب کرنے کے لئے تقسیم ہند کا مطالبہ پیش کیا۔

مسلم انڈیا میں اسی مطالبے کے حق بجانب ہونے کو ثابت کیا گیا ہے اور واقعات سے استدلال کرنے کے لئے مختلف جماعتوں اور مسلکوں کے لیڈروں، مصنفوں، اور صحیفہ نگاروں کی تقریروں اور تحریروں کے حوالے ایک منظم طریقے سے پیش کردئے گئے ہیں۔

جہاں تک مسلم لیگی نقطۂ نظر کا تعلق ہے، مسلم انڈیا، ایک کامیاب کتاب ہے۔ لیکن اگر آپ اس شخص کا زاویۂ نگاہ اختیار کریں، جو محض مسلم ہو، اور سیاست کے اصول انبیاء کی زندگیوں اور پیغاموں سے اخذ کرتا ہو۔ تو آپ تسلیم کریں گے کہ ہمارا مقابلہ محض" انڈین نیشلزم" اور "ہندو نیشلزم" سے نہیں ہے، کہ اس کیلئے "مسلم نیشلزم" اختیار کر کے ہم مطمئن ہو جائیں، بلکہ ہمارا مقابلہ تو "نیشلزم" کے شیطان سے ہے، چاہے وہ کسی نقاب کے ساتھ نمودار ہو۔ ہمیں جہاں کسی قوم کا فرقہ نہیں بننا ہے، وہاں (با صطلاح عہد حاضر) ایک قوم بن کے رہ جانا بھی تو ہمارے لئے بہت بڑی گراں ہے۔ کیونکہ ہمارا منصب ایک بین الاقوامی انقلابی پارٹی کا منصب ہے۔ جو لوگ اس منصب کے دلدادہ ہیں، وہ "مسلم انڈیا" کو ایک طے کئے ہوئے مرحلہ کی حیثیت سے دیکھنے پر مجبور ہیں، اور ان کے خیال میں اب تو کچھ آگے ہی کی باتیں ہونی چاہئیں۔

ہم کیسے پڑھائیں؟ از جناب سلامت اللہ صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی علیگ، معلم "استادوں کا مدرسہ"۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔ صفحات ۲۲۴۔ گرد پوش سے مزین جلد قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ۔

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ، دہلی۔ نئی دہلی۔ لکھنؤ۔ بمبئی ۳۔

انسانی زندگی بحیثیت مجموعی ایک بلی چوڑی کل ہے۔ یہ صدیوں سے پیہم معروفِ عمل اگر ہے تو اس وجہ سے، کہ قدرت نے ایزادی اور مرمت کا سلسلہ قائم کر رکھا ہے۔ خاندانوں کے ادارے اس مشین کے اجزاء کی تیاری کے لئے خام مواد" یعنی

بچے فراہم کرتے ہیں۔ یہ خام مواد درسگاہوں اور تربیت گاہوں یا دوسرے لفظوں میں "انسان سازی" کے کارخانوں میں بھیجا جاتا ہے۔ جہاں ضرورت کے مختلف پرزے تیار ہوتے رہتے ہیں۔

جغرافی اور تاریخی حالات نے چونکہ انسانوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے، اور ہر گروہ کی تہذیب ایک جداگانہ راستے پر پڑتی ہے، اس لئے دنیا میں ہر جگہ نہ تو ایک جیسے انسان درکار ہیں اور نہ انسانوں کی تیاری ایک نہج پر ہو رہی ہے اشتراکی جمہوری، نازی، فسطائی اور ملوکی ہر نوعیت کی تہذیب کی درسگاہیں بچے کی تربیت ایک جداگانہ طریق سے کرتی ہیں، اور ان کے سامنے انسانیت کا ایک علیحدہ معیار اور ماڈل ہوتا ہے چنانچہ "ہم کیسے پڑھائیں" میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ "جامعہ ملیہ اسلامیہ" کا کارخانہ انسان سازی، کیسے انسان تیار کرنا چاہتا ہے، اور کس طرح کرنا چاہتا ہے۔ کتاب کا اصل موضوع تو طریقۂ تعلیم ہے، لیکن ضمناً یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے، کہ کس نظام کیلئے، اور کس نوعیت کے پرزے تیار کرنے مطلوب ہیں۔

جامعہ ملیہ کے پیشِ نظر ایک متحدہ قومیت، ایک متحدہ تہذیب، ایک متحدہ معاشرت، اور ایک متحدہ جمہوری نظامِ حکومت ہے، اسی نظام کو چلانے کے لئے وہ کارکن سپلائی کرنا چاہتا ہے۔ مستقبل کی قومی منڈی ایسے کارکن چاہتی ہے، جو انفرادی اخلاق میں چاہے مسلمان ہوں چاہے ہندو، البتہ سیاسی اور اجتماعی زندگی میں سو فیصدی ہندستانی ہوں۔ پیشِ نظر کتاب کو پڑھ کر ہم مجبورِ اعتراف ہیں کہ جامعہ نے اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ایک ترقی یافتہ طریقۂ تعلیم ڈھونڈ پایا ہے۔ جناب سلامت اللہ صاحب نے مروجہ طریقۂ تعلیم انتخابِ مضامین، اور ترتیب نصاب کے نقائص کی نشاندھی کر کے اپنے نظریات کو جس طرح پیش کیا ہے۔ ان سے تھوڑا بہت اختلاف کرنا دوسری بات ہے، لیکن گہری تحقیقات اور تجربات کے ان نتائج کی افادی حیثیت کو نظر انداز کرنا ظلم ہے

اس قسم کی کتابوں کو دیکھ کر ہم اس صبح سعادت کا انتظار زیادہ شدت کے ساتھ کرنے لگتے ہیں۔ جب کچھ مسلمان ماہرینِ تعلیم انقلابی عزائم کے ساتھ اٹھیں گے، اور ایک ایسی اسلامی درسگاہ کے لئے نظریۂ تعلیم طریقۂ تعلیم، اور تدوین نصاب کے اصول متعین کریں گے، جو اسلامی نظام حیات کو چلانے کے لئے "مسلم" کارکن سپلائی کرے۔ آخر کب تک ہم اپنے بچوں کو دوسروں کے حوالے کرتے رہیں گے، کہ لو! ان کو جس سانچے میں چاہو، ڈھال دو۔

سرورق [illegible] پریس [illegible] روڈ لاہور میں طبع ہوا

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

حصہ اوّل

اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالت اور مستقبل کے امکانات پر ایک سبق آموز تبصرہ جس سے مسلمانانِ ہند کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصوّر پیدا ہوتا ہے۔ اِس کتاب کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی ضرورت ہے۔ اسلئے قیمت بہت کم رکھی گئی ہے

حصہ دوم

اِس حصہ میں ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات پر مفصل تبصرہ کرکے بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی غفلت سے اِس وقت تک مُلک کے سیاسی تغیرات کس طرح اصولِ اسلام اور مسلمانوں کے قومی مفاد کے خلاف ہوتے رہے ہیں اور یہ کہ اگر اب مسلمان اپنی قومی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں کونسی پالیسی اختیار کرنی چاہیئے۔ اِس کی قیمت بھی اشاعت عام کے لئے بہت کم رکھی گئی ہے:۔

حصہ سوم

مسلمانوں کی موجودہ سیاسی کشمکش کا عملی حل کیا ہے۔ اسلامی حکومت کن اصولوں پر قائم کی جا سکتی ہے۔ ایسا اقدام کرنے والے گروہ کو کن اصولوں پر منظم کیا جا سکتا ہے، اور ان اصولوں پر جس قدر اعتراضات و شبہات کئے جا سکتے ہیں، ان کا جواب دیا ہے۔ یہ تمام باتیں اس حصہ میں شرح و بسط کے ساتھ بیان کر دی گئی ہیں۔

قیمت حصہ اول	حصہ دوم	حصہ سوم	علاوہ
فی جلد ۱-۰-۰	فی جلد ۲-۰-۰	فی جلد ۱-۸-۰	محصول ڈاک

دفتر رسالہ ترجمان القرآن دارالاسلام، پٹھانکوٹ، (پنجاب)